مبادیاتِ فلسفہ

برائے انٹرمیڈیٹ

(حصّہ اوّل)

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ محفوظ ہیں۔

منظور کردہ: وفاقی وزاتِ تعلیم (شعبہ نصاب) حکومتِ پاکستان، اسلام آباد

اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپرز، گائیڈ بکس، خلاصہ جات، نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

فہرست مضامین

باب 1:	فلسفہ کی تعریف	1
باب 2:	فلسفہ اور مذہب	16
باب 3:	فلسفہ اور سائنس	26
باب 4:	علم	38
باب 5:	مابعد الطبیعات	53
باب 6:	اخلاقیات	61
باب 7:	اسلامی اقدار	73
باب 8:	حکمت۔ مفہوم اور دائرہ کار	91
	حل مشقی سوالات	104
	فرہنگ	106
	کتابیات	109

مصنف: ڈاکٹر جاوید اقبال ندیم، ایسوسی ایٹ پروفیسر فلسفہ (ر)

یونیورسٹی کالج آف ایجوکیشن، لوئر مال، لاہور

زیرنگرانی: فریدہ صادق

آرٹسٹ: مسز عائشہ وحید

ناشر: ایمی پرنٹرز لاہور

مطبع: الرحیم آرٹ پریس لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
مئی 2019ء	اول	7	2,000	53.00

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

باب 1

فلسفہ کی تعریف (Definition of Philosophy)

انسان ذہنی طور پر کچھ نہ کچھ جاننے کی جستجو کرتا ہے۔ جیسے جیسے علمی اور فکری مسائل حل ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے فکر کے نئے نئے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ انسان حیرانی اور استعجاب کی گہرائیوں میں گرتا ہے تو پھر فلسفہ ہی اسے اس فکری بھنور سے باہر نکالتا ہے۔ اسی لیے یونانی فلسفی افلاطون نے کہا تھا کہ فلسفے کی ابتدا حیرت وتعجب اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش سے ہوتی ہے۔ انسان کا شعور بتدریج پختہ ہوتا جاتا ہے، شعور کی بلندیاں انسان کی حیرانی میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ فلسفہ اس حیرانی کو دور کرتا ہے اور اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے حیران کن سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فکر عموماً اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کو کوئی ذہنی مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ کسی فکری مسئلے کا حل جبلی طور پر ممکن نہیں۔ جب انسان کسی مشکل مسئلہ اور اس کے جوابی فعل کے درمیان وقفہ میں مخصوص ذہنی عمل سے گزرتا ہے تو اسی ذہنی عمل کو فکر کہتے ہیں جو جبلتِ تجسس کی تسکین کرتی ہے۔ یہی ذہنی عمل ان مخصوص حالات اور ماحول میں انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ جسے ہم فلسفیانہ سوچ وبچار کہتے ہیں۔ ہر شخص کی سوچ کی ایک سطح ہوتی ہے جسے انفرادی یا ذاتی فلسفہ کہا جاسکتا ہے۔ کسی شخص کا انفرادی نقطۂ نظر یا ذاتی فلسفہ، عقائد اور اقدار پر مبنی ہوتا ہے جبکہ منظم اور کائناتی فلسفہ میں منطقی ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔

انسان کے ذہن میں ہمیشہ تین قسم کے سوالات ابھرتے رہتے ہیں یعنی کوئی شے کیا ہے؟ کیسے ہے؟ اور کیوں ہے؟

کیا اور کیسے کے جواب سائنسی فکر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں جبکہ کیوں کا جواب فلسفہ مہیا کرتا ہے جس سے خیالات، تصورات، اصول اور کلیے وضع کیے جاتے ہیں اور ان کی قدر ومنزلت اور اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

فلسفہ دراصل حقیقت کی تلاش اور حبِ دانش کا نام ہے۔ اسی لیے فلسفیانہ مسائل حل کرنے والے کو حکیم، دانا یا فلسفی کہا جاتا ہے۔ تاریخ فلسفہ یونان کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ فیثا غورث نے سب سے پہلے فلسفہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ فلسفہ ہمیں فکر کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے جس پر جا کر فلسفی صداقت اور حقیقت جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جس میں فلسفہ بہ حیثیتِ مجموعی فکرِ انسانی اور ممکنہ حقیقت کی ایک تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فلسفی انتہائی اعلیٰ درجے کا وہ ذہین وفطین شخص ہوتا ہے جو اپنے فکر ونظر سے اشیا ونظریات کی ابتدا اور انتہا جاننے کی تگ ودو کرتا ہے۔ انگریزی زبان کا لفظ Philosophy حقیقتاً یونانی الاصل ہے جس میں PHILIA کے معنی Love یعنی محبت کے ہیں اور SOPHIA کے معنی Wisdom یعنی حکمت ودانائی کے ہیں۔ اس طرح Philosophy کے لغوی معنی "LoveofWisdom" یعنی ''محبتِ حکمت یا حبِ دانش'' ہیں۔

فلسفی وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہر طرح کی ازلی وابدی اور عدیم التغیر اشیا و نظریات کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ہم تاریخ فلسفہ کو تین بڑے ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ دورِ اول قدیم دور ہے جس میں فلسفوں کی تقسیم اس طرح ہے۔ ہندی فلسفہ، چینی فلسفہ، ایرانی فلسفہ، مصری فلسفہ اور یونانی فلسفہ شامل ہیں دورِ ثانی ازمنہ وسطیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے جس میں مسلم فلسفہ، عیسائی فلسفہ اور عبرانی فلسفہ اہم ہیں، دورِ ثالث میں فلسفہ جدید اور پسِ جدیدیت شامل ہیں۔

دورِ اوّل میں یونانی فلسفیوں میں تھیلیز، ہراکلائٹس، ایمپیڈوکلیز، پارمینڈیز، فیثا غورث، پروٹا غورس، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان عظیم یونانی فلسفیوں نے میدانِ فلسفہ میں کمال نظریات پیش کیے جو ابھی تک تازہ ہیں۔

دورِ ثانی یعنی ازمنہ وسطیٰ کے مسلمان فلسفیوں میں الکندی، الفارابی، ابن سینا، ابن مسکویہ، امام الغزالی، ابنِ ماجہ، ابنِ طفیل، ابنِ رشد، امام ابوبکر رازی، ابنِ خلدون اور ابنِ عربی آسمانِ فلسفہ پر چمکتے ستارے ہیں جنہوں نے متعدد فلسفیانہ اور مذہبی مسائل کو حل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اسی طرح دورِ ثالث میں فلسفہ جدید اور پسِ جدیدیت کے معروف فلسفیوں میں ڈیکارٹ، کانٹ، ہیگل، نٹشے، برگساں، رسل، وائیٹ ہیڈ، وٹگن سٹائین، دریدا اور چومسکی وغیرہ مشہور ہیں۔

فلسفیانہ افکار بعض اوقات قوموں کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ بعض اوقات عرصہ دراز تک کسی قوم کا کوئی فلسفہ سامنے نہیں آتا لیکن یہ بات واضح ہے کہ انسان ہمیشہ حقیقت جاننے کی تگ و دو کرتا رہتا ہے، جو یقیناً ہمیشہ جاری رہے گی۔

ہر دور میں سچائی کی تلاش اور اسے حاصل کرنے کی خواہش میں مسلسل جدوجہد کرنے کا نام فلسفہ ہے۔ انسان جب کوئی نئی شے دیکھتا یا آواز سنتا ہے تو حیران ہوتا ہے۔ یہ حیرانی کا عمل اس کے ذہن میں سوالات پیدا کرتا ہے۔ سوچ و بچار اور فکر پیدا کرتا ہے۔ اسی حیرانی سے فلسفے کی ابتدا ہوتی ہے سوچ و بچار اور فکر کا نام ہی فلسفہ ہے۔ افلاطون نے کہا ہے:

"Philosophy begins with wonder"

جس طرح یونانی فلسفی افلاطون کا خیال ہے کہ فلسفہ کی ابتدا حیرانی سے ہوتی ہے اسی طرح فلسفہ جدید کے بانی ڈیکارٹ (Descartes) کے خیال میں فلسفے کی ابتدا شک اور شبہے کی اذیت ناک ذہنی کیفیت سے نجات حاصل کرنے کی فطری آرزو کی وجہ سے ہوتی ہے۔ شک و شبہے سے مراد تشکیک کا عمل ہے۔ یعنی کسی صورت حال یا شے کے متعلق جب تک یقین نہ ہو جائے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ گویا اُسے شک (Doubt) سے دیکھا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت کیا ہے؟ اصلیت کیا ہے؟ کیا یہ شے جیسی نظر آتی ہے حقیقت میں بھی ویسی ہے جو نظریہ یا تعقل استعمال کیا گیا ہے وہ مستند ہے یا نہیں ہے۔ کہیں الفاظ کا گورکھ دھندا تو نہیں ہے۔

"Philosophy Begins with Doubt" Descartes

جدید دور میں فلسفے کا مفہوم مزید ترقی پا گیا ہے۔ فلسفے کے دو اہم کام یا افعال ہیں۔ پہلا ترکیب (Synthesis) اور دوسرا تحلیل یا تجزیہ (Analysis)۔ فلسفہ بکھری ہوئی سوچ کے تانے بانے بنتا ہے ترکیب کا کام ایک دائرے کے اندر رہ کر فکری مغالطے ختم کر کے سوچ کی اکائیاں یکجا کرنا ہے۔ جس سے اجزا کی اہمیت کو کل کے ساتھ ان کی وابستگی کے حوالے سے اجاگر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تحلیل (Analysis) کے عمل سے اشیا، نظریات اور تعقلات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تجزیہ سے اصل حقائق اور حیثیت سے شناسائی حاصل ہوتی ہے۔

تجزیہ ہو یا ترکیب یہ دونوں خصوصی حیثیت کے حامل اعمال ہیں۔ کوئی عمومی ذہنی سطح کا شخص ایسا کمال نہیں دکھا سکتا۔ یوں فلسفہ صرف فلسفیوں کے لیے ہوتا ہے، عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔

تمام تر علوم کی ابتدا فلسفہ ہی سے ہوئی ہے جو شخص طبیعیات، کیمیا، طب، ہندسہ، موسیقی، نفسیات، معاشیات، فلکیات، مابعد الطبیعیات غرضیکہ تمام علوم پر دسترس رکھتا ہے اُسے دانا، حکیم یا فلسفی کہا جاتا ہے۔ وہ عقلی اور فکری لحاظ سے دوسروں سے برتر ہوتا ہے۔ فلسفہ ہی سے تمام علوم نکلے ہیں کانت (Comte) نے اسی لیے فلسفے کو ام العلوم کہا تھا یعنی فلسفہ تمام علوم کی ماں ہے۔

فلسفی نظریہ قائم کرتا ہے اور سائنسدان اس پر عمل کر کے آسائشات پیدا کرتا ہے۔ فلسفہ نظری ہوتا ہے اور سائنس اس کا عملی پہلو۔ اس طرح فلسفہ سائنس کی رہنمائی کرتا ہے۔ ڈبلیو ٹی سٹیس (W.T.STACE) کے خیال کے مطابق دیگر سائنسی علوم جہاں آ کر ختم ہوتے ہیں فلسفہ اُس سے آگے اپنی تحقیقات کا آغاز کرتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ پہلے نظریہ پیدا ہوتا ہے پھر اس نظریہ پر سائنسدان عمل کرتے ہیں۔ جہاں جا کر سائنس کا کام مکمل ہو جاتا ہے۔ وہاں پھر کسی نہ کسی نظریہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ نظریہ سائنس کو فلسفیانہ ذہن رکھنے والے لوگ مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) کا کہنا ہے کہ سائنس جزوی طور پر منظم علم ہے جبکہ فلسفہ کلی طور پر منظم علم ہے۔ فلسفے میں زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے منظم اور مرتب انداز سے وسعتِ قلب اور وسیع النظری سے کام لیا جاتا ہے۔

فلسفیانہ افکار مقفل ذہنوں کو کھولتے ہیں اس طرح انسانی ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ پوری کائناتی فضا کے بند دریچے آہستہ آہستہ خود بخود وا ہو جاتے ہیں۔ فلسفہ ہی کی بدولت دنیا کے تمام علوم ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ جس سے انسان تخیلاتی کائنات میں بالعموم معنویت، ترتیب، توازن اور کلیت پیدا کرتا ہے۔ فلسفہ علم کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔

تنقید ہو کہ تحقیق، ترکیب ہو کہ تحلیل سب کی بنیادیں فلسفہ مہیا کرتا ہے۔ فلسفہ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کا طریق کار ہے۔ سوچ وبچار اور فکری کاوش سے صرف فلسفہ ہی بتاتا ہے کہ وجود کی اصل ماہیت اپنی فطرت میں کیا ہے؟

فلسفیانہ سوالات (Philosophical Qusestions)

فلسفے کا بنیادی کام ہی سوالات اُٹھانا ہے۔ انسان کو اس قابل بنانا کہ وہ جس میدان میں بھی کام کر رہا ہو وہاں فکری انداز سے سوچنے کے قابل ہو جائے۔

ہمیشہ سے ہی ذہنوں میں چند ایک مخصوص سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں، مثلاً انسان کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ علم کیا ہے؟ سوچ وبچار کیسے ممکن ہے؟ وہ کون سے علوم ہیں جو معیار مقرر کرتے ہیں؟ بنیادی طور پر یہ فلسفے ہی کے سوالات ہیں۔ ان کا جواب تلاش کرنا فلسفیوں کا کام ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلسفہ وہ ہے جو فلسفی کرتے ہیں یعنی فلسفی اپنی فکری کاوشوں سے جو نظریات قائم کرتے ہیں دراصل وہی فلسفہ ہوتا ہے۔

فلسفے کے موضوعات، عنوانات یا سوالات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جس میں فلسفے کی فکری سرحدیں طے کرنا ناممکن ہے۔ لیکن کسی حد تک جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ فلسفے کا دائرہ کار اور معیار کیا ہے؟

فلسفے کا دائرہ کار (Scope of Philosophy)

فلسفے کے دائرہ کار سے مراد یہ ہے کہ فلسفے کی وسعت کیا ہے؟ یعنی فلسفے میں کون سے اہم موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں؟ فلسفہ کن عنوانات یا علوم پر بحث کرتا ہے؟ ویسے کہا جاتا ہے کہ فلسفہ ''ام العلوم'' ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام علوم فلسفہ ہی سے برآمد ہوئے ہیں۔ قدیم فلسفی تمام علوم کے ماہر تھے۔ ایک فلسفی طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، نباتیات، نفسیات، معاشیات، ہندسہ، منطق، معاشریات، تاریخ غرضیکہ تمام علوم کا ماہر ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ علم کی جس شاخ میں ترقی ہوتی گئی وہ فلسفہ سے الگ اپنی حیثیت قائم کرتا چلا گیا۔

طبیعیات، کیمیا وغیرہ فلسفے سے پہلے علیحدہ ہوئے جبکہ نفسیات کو الگ اپنی حیثیت قائم کیے تقریباً ایک سو سال ہوئے ہیں۔

فلسفہ کو موضوعات کے لحاظ سے تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

فلسفہ کا دائرہ کار
Scope of Philosophy

Axiology	Epistemology	Ontology
قدریات	علمیات	وجودیات

1:۔ وجودیات (Ontology)

فلسفے کے اہم موضوعات میں سے یہ سوال بھی ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ کائنات کی حقیقت اس کی نوعیت اور ماہیت کو کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے؟ کائنات کی اساس کیا ہے؟ کائنات کیسے بنی ہے؟ اس کی ابتدا کیا ہے؟ اس کی اصلیت کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا حل وجودیات میں تلاش کیا جاتا ہے۔ کیا کائنات صرف ایک جوہر سے بنی ہے یا کہ زیادہ جواہر کا مجموعہ ہے۔

وجودیات کو نظریات کے لحاظ سے درج ذیل تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

Ontology وجودیات

Pluralism	Dualism	Monism
کثرتیت	ثنویت	احدیت

(i) احدیت (Monism)

احدیت کے نظریہ کے مطابق کائنات کی ابتدا صرف ایک جوہر سے ہوئی ہے۔ یعنی کائنات صرف کسی ایک جوہر (Substance) سے بنی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے یونانی فلسفی تھیلیز کا خیال تھا کہ تمام کائنات پانی سے بنی ہے۔

(ii) ثنویت (Dualism)

ثنویت کے نظرئیہ کے مطابق کائنات کسی دو جواہر (Substances) سے مل کر بنی ہے، یعنی ذہن (Mind) اور مادہ (Matter) سے۔

(iii) کثرتیت (Pluralism)

کثرتیت کے نظریہ کے مطابق کائنات کی ابتدا ایک جوہر یا دو جواہر سے نہیں ہوئی بلکہ لاتعداد بنیادی جواہر سے کائنات بنی ہے۔ کائنات میں چونکہ مختلف نوعیت کی مختلف اشیا موجود ہیں اس لیے یہ مختلف جواہر کے مجموعہ ہی سے بنی ہے۔

یونانی فلسفی ایمپیڈوکلیز (Empedocles) کے خیال میں کائنات چار بنیادی عناصر یعنی جواہر، (Elements) سے مل کر بنی ہے اور وہ چار بنیادی عناصر پانی، مٹی، آگ اور ہوا ہیں۔ اسی طرح ایک اور یونانی فلسفی ڈیموقریطس (Democritus) کا خیال ہے کہ چار نہیں بلکہ لاتعداد عناصر سے مل کر کائنات وجود میں آئی ہے۔

(2) علمیات (Epsitemology)

علمیات کے دائرہ کار میں اِن سوالات کا جواب تلاش کیا جاتا ہے۔ علم کیا ہے؟ علم کے ماخذ اور حدود کیا ہیں؟ کیا ہم کسی شے کا علم رکھ سکتے ہیں؟ کیا حواس حقیقی ہوتے ہیں؟ جو کچھ ہمیں محسوس ہو رہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے یا کہ دھوکا اور فریب ہے؟ بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ علم کا حصول ممکن ہی نہیں۔ جدید فلسفہ کے بانی ڈیکارٹ (Descartes) کا خیال ہے کہ تشکیک سے علم کو جانچنا چاہیے۔ اس طرح فلسفیانہ سوچ واضح ہوتی ہے اور تشکیک سے پتہ چلتا ہے کہ علم کا حصول ممکن ہی نہیں۔ ہر شے پر شک کر کے دیکھیں اور تجزیہ کریں تو باقی کچھ نہیں بچے گا۔ بعض کا کہنا ہے کہ علم یا خیال انسان کے ذہن میں پیدائشی اور وہبی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ وہبی خیالات (Innate Ideas) کے قائل عقلیت پسند (Rationalist) ہیں۔ وہ نہایت وثوق سے کہتے ہیں کہ انسانی ذہن میں پیدائشی طور پر بعض تصورات موجود ہوتے ہیں۔ جیسے گراموفون کے ریکارڈ میں گانے بند ہوتے ہیں اور گراموفون کی سوئی کے لمس سے یہ سنائی دیتے ہیں یا کمپیوٹر میں استعمال ہونے والی ڈسک میں مواد موجود ہوتا ہے اور کمپیوٹر میں ڈالنے سے وہ سامنے سکرین پر آ جاتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ پیدائش کے وقت انسان کا ذہن ایسے ہی خالی ہوتا ہے جیسے کوئی صاف سلیٹ۔ یہ خیال مشہور فلسفی جان لاک (Johne Locke) کا ہے۔ جس طرح صاف سلیٹ پر بعد میں حروف یا الفاظ لکھے جاتے ہیں اس طرح ذہن پر تجربات اور مشاہدات کی بنا پر خیالات و تصورات کے نقوش بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کو ماننے والوں کو تجربیت پسند (Empirisists) کہا جاتا ہے کہ وہ تجربہ کی بنا پر علم حاصل کرنے کے حامی ہیں۔

تجربیت پسندوں کا نقطہ نظر ہے کہ انسان کا تمام علم اکتسابی ہوتا ہے۔ خواہ اس کا ماخذ کچھ بھی ہو۔

بعض مفکرین حواس اور استدلال سے حاصل کردہ علم کو علم جانتے ہیں اور بعض مفکرین وجدان اور الہام کو صحیح ماخذ علم تسلیم کرتے ہیں۔ علمیات کے موضوع میں ان تمام ذرائع اور ماخذ کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کی بنا پر ہم علم حاصل کرتے ہیں۔ علم کیا ہے؟ مثال کے طور پر ادراک (Perception) کو علم کہتے ہیں۔ جب ہم کچھ محسوس کرتے ہوئے اسے معنی دیتے ہیں تو اس عمل کو ادراک کہتے ہیں۔ جتنا ہمارا ادراک زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی علم بڑھتا ہے۔ حواس سے حاصل کردہ علم میں نقائص ہیں یعنی بعض اوقات ہم التباس یا واہم کا شکار ہو جاتے ہیں اور جو کچھ ہمیں محسوس ہو رہا ہوتا ہے اس کو ہم اپنی دانست کے مطابق معنی پہنا دیتے ہیں حالانکہ حقیقی صورت حال اس سے مختلف ہوتی ہے۔ سڑک پر تیز دھوپ کی شعاعیں منعکس ہوتی ہیں تو ہم دور سے اسے پانی سمجھ لیتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہاں پانی نہیں ہوتا۔ رات کو کم

روشنی یا کسی بھی وجہ سے کلر والی سفید جگہ سے پاؤں اٹھا کر آگے رکھتے ہیں کہ یہ پانی یا کوئی اور شے ہے جبکہ حقیقتاً وہ کلر والی سفید مٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے دور کے درخت حرکت میں دکھائی دیتے ہیں حالانکہ ہم حرکت میں ہوتے ہیں نہ کہ درخت۔ اسی طرح بو، بدبو، خوشبو، ذائقہ اور آواز کا بھی غلط ادراک یا التباس (illusion) ممکن ہے۔

حواس کے ایسے نقائص کی وجہ سے صحیح علم حاصل کرنے سے ہم قاصر ہوتے ہیں۔

(3) قدریات (Axiology)

قدریات میں صداقت کیا ہے؟ قدریات میں کسی شے یا جو کچھ بھی دنیا میں موجود ہے کی حقیقی قدر اور معیار کا ذکر کیا جاتا ہے۔ معیار اور پیمانہ طے کرنے والے علوم کو معیاری علم (Normative Science) کہا جاتا ہے۔ فلسفیانہ افکار میں انسان سائنس کی طرح کلی اور عمومی نتائج مستند طور پر اخذ نہیں کرتا بلکہ اس میں فکر کے ارتقا کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے پوری دنیا کے لیے مستقل اور عمومی اقدار مہیا کرنے کے بجائے مختلف فلسفیوں کے کسی ایک شے، نظریہ یا تعقل کے بارے میں مختلف رائے ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مختلف فلسفی مختلف نظام ہائے افکار و اقدار پیش کرتے رہے ہیں۔ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے لوگوں کی خواہشات میں فرق بھی نئے اور مختلف فلسفوں کو جنم دیتا ہے۔ دنیا کے اکثر فلسفیوں کا اندازِ فکر یکساں نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر مختلف معیارات طے کیے گئے ہیں۔ یونانی سوفسطائی فلسفی پروٹا گورس کا کہنا تھا: ''انسان ہر شے کا پیمانہ ہے''۔

"Man is the Measure of all Things"

ہر انسان کا سوچنے کا معیار اپنا ہے وہ اپنی عقل و دانست کے مطابق کسی شے کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ اقدار جن کی بنا پر معیاری علوم کا تعین کرتے ہیں، تین ہیں۔

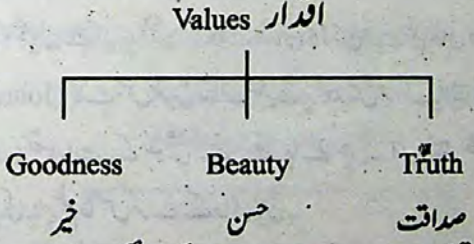

سوچ بچار اور فکر کے صحیح ہونے کا تعلق صداقت (Truth) سے ہے۔ فکر کے صحیح ہونے کے بارے میں بحث سے منطق جنم لیتا ہے جو فکر کے قوانین وضع کرتا ہے۔

حسن و جمال کے حوالے سے معیارات کا تعین جمالیات کو جنم دیتا ہے جس میں بدصورتی اور خوبصورتی کے اصول مقرر کیے جاتے ہیں اور اُن پر بحث کی جاتی ہے۔

خیر کا معیار (Good) کسی شخص کے عمل کی خوبی اور خامی بیان کرتا ہے۔ اس طرح اگر ہم ان تین اقدار صداقت، حسن اور خیر کو سامنے رکھیں تو دنیا میں صرف تین معیاری علوم وضع ہوتے ہیں۔ ان تینوں معیاری علوم کا نقطہ نظر اور ان کی غرض و غایت بالکل مختلف ہے۔ ان کا تعلق اشیا کی ہست و بود سے نہیں ہوتا بلکہ ان کی قدر و قیمت سے ہوتا ہے۔ وہ ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ فلاں اشیا یوں ہیں یا یوں تھیں بلکہ یہ بتاتے ہیں

کہ انہیں یوں ہونا چاہیے۔ وہ ان معیاری اصولوں سے اشیا کی قدر و قیمت کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ معیارات وہ اقدار ہیں جو زندگی کے بارے میں اعلیٰ اور بہترین انداز فکر کو روشناس کراتی ہیں۔

معیاری علوم Normative Sciences

قدریات Axiology

Ethics	Aesthetics	Logic
اخلاقیات	جمالیات	منطق

(i) منطق (Logic)

منطق ایک معیاری علم ہے جو فکر کی صحت (Validity) کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ اور صحیح فکر کے قوانین کا مطالعہ کرتا ہے۔

Logic is a science that studies the laws of valid thought.

علم منطق ہمیں بتاتا ہے کہ فکر کیسا ہونا چاہیے؟ منطق فکر کے نتائج سے بحث کرتا ہے۔ اور ان کی صحت یا عدم صحت کو جانچتا ہے۔ منطق فکر کا معیاری نقطہ نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔

منطق کا لفظ نطق سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں زبان، اس میں زبان اور فکر دونوں کے معنی پائے جاتے ہیں۔ منطق کا موضوع فکر ہے اور صرف و نحو یعنی گرائمر وغیرہ کا موضوع زبان ہے۔ چونکہ فکر اور زبان یعنی خیالات اور الفاظ میں گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا منطق اور علم صرف و نحو آپس میں مربوط ہیں۔ منطق صرف و نحو یعنی گرائمر کے اصول وضع کرنے میں مدد دیتا ہے۔ منطق تصورات، تصدیقات اور استدلات کی صحت کا مطالعہ کرتا ہے۔ یعنی اس کا اہم کام فکر کی صحت دیکھنا ہے۔ علم منطق فکر و استدلال کی قوت کو بڑھاتا ہے اور ہمیں صاف اور صحیح انداز سے سوچنے میں مدد دیتا ہے۔ فکر و استدلال کے قوانین جان کر ہم گمراہ کن استدلال اور فکری مغالطوں سے بچ سکتے ہیں۔ ہر علم کو صحیح فکر و استدلال کی ضرورت ہوتی ہے اور صحیح فکر و استدلال کے قوانین بنانا منطق کا کام ہے۔ اس لیے منطق کو علم العلوم کہا جا سکتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں منطق بے حد مفید ہے۔ روزانہ ہماری صحیح گفتگو منطقی دلائل پر مبنی ہوتی ہے جبکہ غلط افکار منطق کے قوانین کے بغیر ہوتے ہیں۔ ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو اور دلائل میں دانستہ یا نادانستہ طور پر منطق کے اصولوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ اساتذہ، وکلا، واعظ اور مقرر ہر وقت منطق سے استفادہ کرتے ہیں۔ وکیل عدالت میں کسی جرم کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لیے جو دلائل دیتا ہے وہ منطقی دلائل ہوتے ہیں جج جو فیصلہ ان دلائل کو سن کر دیتا ہے وہ بھی منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ منطق وہ علم ہے جو فکر کے ایسے قوانین بتاتا ہے جن کے بغیر صحیح فکر ممکن ہی نہیں۔ فکر کی صحت (Validity) سے مراد یہ ہے کہ فکر میں اپنی ہی تردید نہ پائی جائے اور فکر حقائق کے مطابق ہو۔ اگر فکر میں خود تردیدی نہ پائی جائے تو یہ صحت فکر صوری (Formal) ہوتی ہے۔ اور اگر فکر حقائق کے مطابق ہو تو صحت فکر مادی (Material) ہوتی ہے۔

صوری صحت (Formal Validity) میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ فکر اپنے آپ سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ مادی صحت

(Material Validity) میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ فکر بیرونی حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔صحت کے انہی دو مفاہیم کی بنا پر منطق کو دو شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

منطق Logic

Deductive Logic	Inductive Logic
منطق استخراجیہ	منطق استقرائیہ

منطق استخراجیہ (Deductive Logic)

منطق استخراجیہ استدلال کی صرف صوری صحت (Formal Validity) کو جانچتا ہے۔دیئے ہوئے مقدمات یا جملوں یا قضیوں کو صحیح مان کر منطق استخراجیہ میں دیکھا جاتا ہے کہ نتیجہ مانے ہوئے مقدمات کے مطابق ہے یا نہیں۔

منطق استخراجیہ میں دیئے ہوئے مقدمات یعنی جملوں میں سے چھپا ہوا نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہے۔ مقدمات یا جملوں اور نتائج کی صوری صحت کے بارے میں جانچ پڑتال کرنا منطق استخراجیہ کا کام ہے۔مثلاً:

تمام انسان فانی ہیں۔
سقراط ایک انسان ہے۔
نتیجہ.......... لہٰذا سقراط فانی ہے۔

منطق استخراجیہ کے لحاظ سے پہلے دو جملوں میں سے تیسرا جملہ نتیجے کے طور پر اخذ کیا گیا ہے جو ان میں چھپا ہوا تھا۔ پہلا جملہ ''تمام انسان فانی ہیں'' ۔کے ساتھ جب دوسرا جملہ ''سقراط ایک انسان ہے'' ملایا جاتا ہے تو ہر صورت میں تیسرا جملہ نتیجے کے طور پر نکلتا ہے جو کہ صوری صحت کے اصولوں کے مطابق بالکل صحیح ہے اور اگر پہلا جملہ یہ دیا ہو کہ ''تمام انسان درخت ہیں'' اور دوسرا جملہ ہو ''تمام طلبا انسان ہیں'' تو پھر یہ صورت بنے گی۔

تمام انسان درخت ہیں۔
تمام طلبا انسان ہیں۔
نتیجہ............ لہٰذا تمام طلبا درخت ہیں۔

منطق استخراجیہ چونکہ صوری صحت یعنی واضح شکل وصورت کو دیکھتی ہے تو اس طرح یہ استدلال بالکل صحیح ہے اور تیسرا جملہ (نتیجہ) ''تمام طلباء درخت ہیں'' منطق استخراجیہ کے اصول کے مطابق صحیح نتیجہ اخذ ہوا ہے۔اسی طرح چند ایک مزید مثالیں یہ ہیں۔

1۔ تمام درخت سبز ہوتے ہیں۔
یہ ایک درخت ہے۔
لہٰذا یہ درخت سبز ہے۔

2۔ اس درخت کے تمام سرخ آم میٹھے ہیں۔
بالٹی میں اسی درخت کے سرخ آم ہیں۔
لہٰذا بالٹی میں تمام آم میٹھے ہیں۔

3۔ ایم۔اے کی تمام طالبات حاضر ہیں۔
حرا ایم۔اے کی طالبہ ہے۔
لہٰذا حرا حاضر ہے۔

اوپر دی گئی مثالوں میں تیسرا جملہ نتیجہ کے طور پر خود بخود برآمد ہوتا ہے جو منطق استخراجیہ کے اصولوں کے مطابق بالکل صحیح ہے۔منطق استخراجیہ میں عموماً کل سے جز کا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

منطق استقرائیہ (Inductive Logic)

منطق استقرائیہ میں استدلال کی مادی صحت (Material Validity) کو جانچا جاتا ہے۔نتائج احتمالات (Probables) پر مبنی ہوتے ہیں۔ چند ایک حقائق کا پتہ لگایا جاتا ہے پھر کل کے بارے میں نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ منطق استقرائیہ میں انفرادی حقائق سے عمومی حقائق کی طرف جاتے ہیں۔حقائق کی تصدیق کی جاتی ہے۔منطق استقرائیہ میں حقائق کے باہمی علتی رشتوں کو دریافت کرتے ہیں۔جزوی حقائق کے مشاہدے کی مدد سے کلیہ،قضیے مرتب کیے جاتے ہیں۔منطق استقرائیہ کی مثالیں درج ذیل ہیں: کہ

زید فانی ہے، بکر فانی ہے، اور عمر فانی ہے............
لہٰذا تمام انسان فانی ہیں۔

منطق استقرائیہ کی اس مثال کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں ایک شخص کو مرتے ہوئے دیکھا، دوسرے کو مرتے ہوئے دیکھا، تیسرے کو مرتے ہوئے دیکھا، پھر ایک استقرائی زقند لگا کر کل کے بارے میں رائے قائم کر لی گئی۔

اسی طرح اگر ہم ایک دکان سے ایک قلم خریدتے ہیں وہ صحیح کام کرتا ہے، دوسرا قلم خریدتے ہیں وہ صحیح کام کرتا اور پھر تیسرا یا چوتھا قلم خریدتے ہیں اور وہ بھی صحیح چلتا ہے تو ہم عمومی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "اس دوکان کے تمام قلم صحیح کام کرتے ہیں"۔

منطق استقرائیہ میں پہلے حقائق کا مطالعہ کیا جاتا ہے، مادی صحت کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے پھر کلی یا عمومی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔مثلاً

ایک کوّا سیاہ ہے، دوسرا کوّا سیاہ ہے، تیسرا کوّا سیاہ ہے، چوتھا کوّا سیاہ ہے............
لہٰذا تمام کوّے سیاہ ہوتے ہیں۔

یہ دوسرا جملہ عمومی نتیجہ ہے۔ جو منطق استقرائیہ کے اصول کے مطابق سامنے آیا ہے یا خود بخود قائم ہوا ہے۔لیکن اس سے قبل کوؤں کے سیاہ ہونے کی تصدیق یعنی مادی صحت کو جانچا گیا ہے۔

(ii) جمالیات (Aesthetics)

جمالیات بھی معیاری علم ہے اس میں حسن و جمال کے معیار کا تعین کیا جاتا ہے۔ جمالیات ہمارے احساسات کے حسن وقبح سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ "خوب وزشت" کا معیاری نقطہ نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔

آنکھ ملکہ حواس ہے۔ اسی لیے آنکھ کے ذریعے حاصل کردہ علم کی اہمیت زیادہ ہے۔ کسی آرٹسٹ کی خوبصورت پینٹنگ، کسی شاعر کی کہی ہوئی نظم یا غزل ذوقِ جمال کی بہترین تسکین کرتی ہیں۔ آرٹسٹ اور شاعر جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لئے عملی کاوش کرتے ہیں۔

جمالیات میں خوبصورت (Beautifull) اور بدصورت (Ugly) اشیا کی قدر و قیمت پر بحث کی جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ اشیا یقیناً ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی ہمیں نظر آتی ہیں اور بعض اوقات ہمارے مزاج، ذہنی الجھن یا پریشان کن مشکلات کی وجہ سے خوبصورت چیزیں اچھی نہیں لگتیں۔

جمالیات میں حواس سے حاصل کردہ کسی بھی طرح کے علم کی حسن وخوبی یا اس کے قبیح ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور معیار طے کیا جاتا ہے۔ مثلاً مری کی پہاڑیوں کے مناظر اچھے لگتے ہیں یہ ہمیں حسن جمال ہی بتاتا ہے۔ خوشبو کیوں بھلی لگتی ہے؟ یا بدبو کیوں بری لگتی ہے؟ یہ جمالیات ہی کے مسائل ہیں۔ کوئی آواز اچھی لگتی ہے یا شور برا محسوس ہوتا ہے یہ بھی جمالیات ہی کا موضوع ہے۔ یعنی حواس کے ذریعہ جو بھی ادراک حاصل ہوتا ہے اس کے حسن وخوبی اور دوسرے پہلو یعنی قبیح ہونے کا مطالعہ علم جمالیات کرتا ہے گویا کہ جمالیات وہ معیاری علم ہے جس میں تجزیہ و مشاہدہ کے ذریعے ہم حسن اور غیر حسن کا فرق کرتے ہیں۔ معیارِ حسن کیا ہے؟ اس کے لیے کونسے اصول کام کرتے ہیں؟ خوشی اور غمی کے احساس کے فرق کی بنیاد کیا ہے؟ جیسے خوشی کے لمحات میں ماحول بے حد خوشگوار ہوتا ہے گھڑیاں جلد گزر جاتی ہیں غمگین اور اداس ماحول میں وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ اس طرح مضحکہ خیزی (Comic) کا تصور بھی جمالیات کے تحت آتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ بعض اوقات گفتگو یا واقعاتی صورتِ حال میں مضحکہ خیز انداز اپنایا جاتا ہے۔ اس پہلو کا مطالعہ بھی جمالیات ہی کرتی ہے۔

(iii) اخلاقیات (Ethics)

اخلاقیات میں عمل کے معیار کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ انسان کا کون سا کام صائب ہے اور کون سا غیر صائب ہے؟ کوئی شخص اچھے افعال کرتا ہے یا برے افعال اس کا فیصلہ اخلاقیات کرتی ہے۔

پروفیسر جان ڈیوی (Dewey) کے خیال میں "اخلاقیات وہ معیاری علم ہے جس میں کردار پر خیر وشر یا صواب وخطا کے نقطہ نظر سے بحث کی جاتی ہے"۔

انگریزی زبان کا لفظ (Ethics) یونانی زبان کے لفظ (Ethos) سے نکلا ہے۔ جس کے لفظی معنی عقائد و رسوم کے ہیں۔ گویا رسم و رواج کے علم کو بھی اخلاقیات کہا جاتا ہے اسی طرح لاطینی زبان کا لفظ (Moral) جو (Mores) سے مشتق ہے، کا مطلب بھی رسم و رواج ہے۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص، گروہ، خاندان، قبیلہ یا قوم جس طرح کے رسم و رواج اپناتے ہیں اُسی طرح کی اُن کی اخلاقیات ہوتی ہے۔

اخلاقیات کا علم معیاری ہے یہ انسانی کردار کو خیر وصواب کے نظریہ سے پرکھتا ہے۔ اخلاقیات معاشرے میں پھیلی ہوئے غیر مربوط اور غیر مسلسل معلومات کو اکٹھا کر کے ایک سلسلے میں منسلک کرتا ہے۔ ان سے اصول اور کلیات وضع کر کے معیار و اخلاق طے کیا جاتا ہے۔ پروفیسر راجرس (Rogers) نے اپنی کتاب ''تاریخ اخلاقیات'' میں لکھا ہے کہ ''جو علم ایسے اصول بتاتا ہو جن سے انسانی کردار کے صحیح مقاصد کی حقیقی اور سچی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے اس کا نام علم الاخلاق ہے''۔ اسی طرح پروفیسر للی (Lillie) کا خیال ہے کہ ''اخلاقیات انسانی کردار کی معیاری (Normative) سائنس ہے کردار کا مطالعہ خیر وشر یا صواب وخطا کی حیثیت سے کرتی ہے''۔

انسانی کردار کے دو اہم پہلو ہیں ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ انسانی کردار کا داخلی پہلو مقاصد محرکات اور نیتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جبکہ کردار کا خارجی پہلو جسمانی افعال واعمال پر مبنی ہوتا ہے۔ اخلاقیات میں کسی فرد کے افعال کے اچھے اور برے دونوں پہلو دیکھے جاتے ہیں۔

عام طور پر خارجی کردار کی نفاست اور ظاہری آرائش کو معیار اخلاق نہیں سمجھا جاتا بلکہ فرد کی نیت پر اس کے کردار کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح صورت کے ساتھ سیرت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ کردار کے خارجی پہلو کے بجائے داخلی پہلو کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔ اخلاقیات میں کسی شخص کے خارجی اور داخلی کردار کا اچھا یا برا ہونا جانچا جاتا ہے۔ اس لیے اسے معیاری علم کہا جاتا ہے۔

فلسفیانہ نہج (Philosophical Approach)

فلسفہ کا خصوصی موضوع اساسِ علم اور اساسِ وجود کو جاننا ہے۔ کائنات میں موجود ہر شے میں علتی رشتے تلاش کرنا ہے۔ تحقیق و تفحص کے اس انداز کو کسی بھی نظریہ یا شے کی تنقید و تجزیہ کی تہہ تک پہنچنا کہتے ہیں۔ حقائق کا پتہ لگاتے ہوئے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ کیا، کیوں اور کیسے کے سوالات کا جواب تلاش کیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بھی ایسا طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اسے فلسفیانہ نہج (Philosophical Approach) کہا جاتا ہے۔

اگر کوئی فرد کسی بھی بات کو جیسی کہ ہے بغیر دلیل کے نہ مانے، تحقیق کا طریق کار اپنائے، علت و معلول کا رشتہ تلاش کرے، نئی نئی موشگافیاں کرے، ہر موضوع یا عنوان کے نئے معنی تلاش کرے، منطقی نتائج اخذ کرے، جذبات و احساسات کی رو میں بہنے کے بجائے عقل و استدلال سے کام لے، فکر کی ترویج و ترقی کا سوچے اور ہمیشہ اس کاوش میں لگا رہے کہ ہر نئی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے عقل کا استعمال کرنا چاہیے تو سمجھ لیجئے یہ فلسفیانہ نہج ہے۔

فلسفیانہ نہج کا اپنا ہی طریق کار ہے۔ اس میں بنے بنائے نظریات کو آخری سمجھنے کی بجائے اسے رد کر کے نئے نظریات تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ ردِ فلسفہ بھی فلسفہ ہی کہلاتا ہے۔ فلسفہ مختلف علوم کے فراہم کردہ حقائق کو باقاعدہ نظام کے اندر متحد کرتا ہے۔ ان کی بنا پر ہمہ گیر نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ فلسفہ حقائق کی ناقابل تحلیل و تحویل یا انتہائی ماہیت یا حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش کا نام ہے۔

فلسفیانہ نہج یہ ہے کہ جزیات سے آگے کائنات پر من حیثِ کل نگاہ ڈالی جائے۔ عقل واستدلال کے ذریعے ہر شے یا نظریہ کی انتہائی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔ کوشش سے مراد یہ ہے کہ فلسفہ میں نتائج کو حتمی نہیں مانا جاتا آئندہ آنے والے فلسفیوں کے لئے تنقید و تبصرے اور نشوونما کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ تعصب، تنگ نظری اور سطحی انداز فلسفے کا کام نہیں ہے بلکہ اس کا انداز بہت وسیع ہوتا

ہے۔ فلسفے کی اہمیت بھی یہی ہے۔ یونانی فلسفی افلاطون نے کہا تھا کہ فلسفی سارے زمان و مکان کا ناظر ہوتا ہے۔

فلسفیانہ انداز نظر کی بنیادیں فکری سوالات پر مبنی ہوتی ہیں جس سے کسی بھی نظریہ یا تعقل کو تحقیقی طور پر جانچا جاتا ہے نتائج اخذ کرتے ہوئے منطقی طریق کار اپنایا جاتا ہے۔

تنقید / سوچ و بچار (Criticism / Speculation)

فلسفے کا سب سے اہم کام تجزیہ کرنا ہے۔ تجزیہ کی مدد سے نظریات، تعقلات اور اشیا کو اجزا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، کسی بھی فکر یا نظریہ کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔ گویا تنقید ایک ایسا فن ہے جس کی بنیادیں فلسفہ مہیا کرتا ہے سائنسی اور سماجی علوم وفنون سے متعلق موضوعات مضامین پر تنقیدی انداز نظر سے بحث کی جاتی ہے۔

تفکر و تجسس انسان کی جبلّت میں ہے۔ جس کی بنا پر جستجو و کاوش کی جاتی ہے۔ عقلِ انسانی ہر دور میں افکارِ پوشیدہ سے حجاب اٹھاتی رہتی ہے۔ ان حجابات کو عیاں کرنا اور سربستہ رازوں کو فاش کرنا فلسفے کا مقصود و مطلوب ہے۔ فلسفہ ہمیں پوری کائنات کا احاطہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ بعض اوقات تشکیک کے انداز سے اور بعض دفعہ انکشاف و معرفت کے درجوں سے علمی و فکری منازل طے کی جاتی ہیں۔ مشکل سے مشکل مسائلِ زیست کی وضاحت صرف فلسفیانہ انداز ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ قدیم اقوام کے نظریات، فلسفہ یونان، مسلم فلسفہ، فلسفہ جدید اور پس جدیدیت تک سب ادوار میں مختلف نظام ہائے فکر بیان کئے گئے خداداد صلاحیتوں کے مالک فلسفیوں کی بصیرت اور سوچ و بچار سے یہ سب کچھ ممکن ہوا۔

تمام مذاہب میں پیغمبرانہ فکر و نظر کی ابتدا سوچ و بچار اور تفکر سے ہوئی ہے۔ خدا سے رابطہ ایک طرح سے فکری انتہا کی بہترین مثال ہے فلسفہ سوچ بچار ہی کی مدد سے توجیہات پیش کرتا ہے۔ کائنات میں اگر کچھ موجود بھی ہے تو اس کی ماہیت، فطرت، قدر و قیمت، غرض و غایت کی وضاحت صرف فلسفہ ہی کر سکتا ہے۔ زندگی، موت، زندگی بعد از موت، ارتقا، ابتدا اور انتہا، معاشرتی، معاشی، اخلاقی، سیاسی، علمی، سائنسی اور فکری جہتیں فلسفہ واضح کرتا ہے۔ الفرڈ ویبر (Alfred Weber) کا خیال ہے کہ فلسفہ فطرت کے ایک جامع نقطہ نظر کی تلاش اور اشیا کی ہمہ گیر توجیہہ کی کوشش کو کہتے ہیں۔

> "Philosophy is a search for a comprehensive view of nature and attempt at a universal explaination."

اسی طرح مشہور مفکر ولیم جیمز (William James) کا کہنا ہے:

> ''فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی نظر سے اوجھل حقائق کی فلسفہ ہی فکری انداز سے تشریح کرتا ہے۔ فلسفیانہ سوچ و بچار اور تنقیدی طریق کار سے حقائق تلاش کیے جاتے ہیں۔

دنیا میں ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی ایسی ہستی ضرور موجود ہوتی ہے۔ جو فکر کی کسی بھی شاخ کو سوچ بچار سے تخلیقی و تحقیقی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔ طبعیات، کیمیا، نباتیات، اخلاقیات، منطق، نفسیات، علمیات، فلکیات غرضیکہ کائنات کی علتِ اولیٰ دریافت کرنے کے لئے کسی

بھی علم میں فلسفیانہ سوچ بچار (Speculation) اور تنقید (Crtiticism) اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفے کے بغیر کوئی علم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

مشقی سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1:۔ فلسفہ کی تعریف بیان کریں۔

2:۔ فلسفہ کا دائرہ کار کیا ہے؟

3:۔ فلسفہ کے اہم موضوعات کون کون سے ہیں؟

4:۔ فلسفہ کی اہمیت بیان کریں۔

5:۔ درج ذیل میں کسی دو پر نوٹ لکھیں۔

1۔قدریات 2۔علمیات 3۔وجودیات

معروضی طرز (Objective Type)

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

1:۔ فلسفہ جدید کا بانی...................... ہے۔

2:۔ منطق فکر کے قوانین کا...................... کرتا ہے۔

3:۔ قدریات میں................علوم کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

4:۔ فلسفی کا لفظ سب سے پہلے................ نے اپنے لئے استعمال کیا۔

5:۔ فلسفی نظریہ قائم کرتا ہے اور............اس پر عمل کر کے آسائشات پیدا کرتا ہے۔

6:۔ فلسفہ کے دائرہ کار میں وجودیات، علمیات اور..........شامل ہیں۔

7:۔ احدیت کے نظریے کے مطابق کائنات کی ابتدا.......... جوہر سے ہوئی ہے۔

8:۔ کائنات چار بنیادی عناصر سے مل کر بنی ہے۔ یہ یونانی فلسفی..........کا خیال ہے۔

9:۔ تجربیت پسندوں کا خیال ہے کہ انسان کا تمام علم..........ہوتا ہے۔

10:۔ منطق ایک معیاری علم ہے جو..........کی صحت کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔

سوال 2:۔ ذیل میں دیئے ہوئے سوالات کے ممکنہ چار جوابات میں سے صحیح جواب کی نشاندہی کریں۔

1:۔ فلسفہ کے لفظی معنی ہیں۔

1:۔ جدید علم 2:۔حب دانش 3:۔حب سائنس 4:۔قدیم سوچ

2:۔ درج ذیل میں سے یونانی فلسفی ہے۔

1:۔ ہیگل 2:۔افلاطون 3:۔الفارابی 4:۔نٹشے

3:۔ درج ذیل میں سے پہلا مسلم فلسفی ہے۔

1:۔سقراط 2:۔الکندی 3:۔صفوان 4:۔برگساں

4:۔ درج ذیل میں سے جدید فلسفہ کا بانی ہے۔

1:۔ارسطو 2:۔ڈیکارٹ 3:۔ابن سینا 4:۔سپنسر

5:۔ یہ کس نے کہا تھا۔ ''فلسفے کی ابتدا حیرانی سے ہوتی ہے۔''

1:۔ولیم جیمز 2:۔امام الغزالیؒ 3:۔افلاطون 4:۔ابن خلدون

6:۔ یہ کس نے کہا تھا۔ ''فلسفہ کی ابتدا شک سے ہوتی ہے؟''

1:۔تھیلیز 2:۔ڈیکارٹ 3:۔سارتر 4:۔سٹیس

7:۔ علم منطق کا تعلق کس سے ہے؟

1:۔استدلال 2:۔تحریر 3:۔تقریر 4:۔کاوش

8:۔ اخلاقیات میں بحث کی جاتی ہے۔

1:۔انسانی کردار کی 2:۔حسن و جمال کی 3:۔منطقی دلائل کی 4:۔علم کی

9:۔ درج ذیل میں معیاری علم کون سا ہے۔

1:۔کیمسٹری 2:۔منطق 3:۔ریاضی 4:۔جغرافیہ

10:۔ منطقی نتیجہ اخذ کرنے کے لئے جز سے کل کی طرف کس میں جایا جاتا ہے۔

1:۔استقرائیہ 2:۔استخراجیہ 3:۔اقدار 4:۔تحلیل

سوال 3: کالم ''الف'' اور کالم ''ب'' میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم ''ج'' میں درج کریں۔

کالم ''الف''	کالم ''ب''	کالم ''ج''
فلسفہ	بتدریج پختہ ہوتا جاتا ہے۔	
فلسفہ عصری	علم العلوم ہے۔	
منطق	پانی، مٹی، آگ اور ہوا ہیں۔	
انسان کا شعور	ام العلوم ہے۔	
فلسفے کا بنیادی کام ہی	انسان کی جبلت میں ہے	
یہ کائنات کے بنیادی عناصر	ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی	

فلسفے کے دو اہم افعال	کرنا ہی فلسفہ ہے	
سوچ و بچار اور فکر	سوالات اٹھانا ہے	
تعصب، تنگ نظری اور سطحی انداز	ترتیب اور تحلیل یا تجزیہ ہیں۔	
تفکر و تجسس	فلسفے کا کام نہیں ہے۔	

سوال 4:۔ ذیل میں فقرات میں سے صحیح و غلط کی نشاندہی کیجئے۔

1:۔ یونانی فلسفی افلاطون کا خیال ہے کہ فلسفہ کی ابتدا، حیرانی سے ہوتی ہے۔ صحیح/غلط

2:۔ فیثا غورث نے سب سے پہلے فلسفہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ صحیح/غلط

3:۔ فلسفیانہ افکار ذہن کو مقفل کر دیتے ہیں۔ صحیح/غلط

4:۔ ڈیکارٹ جدیدیت کے مصروف فلسفیوں میں سے ایک ہے۔ صحیح/غلط

5:۔ فلسفی نظریہ قائم کرتا ہے اور سائنسدان اس پر عمل کر کے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ صحیح/غلط

6:۔ سائنس علم کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ صحیح/غلط

7:۔ تنقید ہو کہ تحقیق، ترکیب ہو کہ تخلیق سب کی بیاد میں فلسفہ مہیا کرتا ہے۔ صحیح/غلط

8:۔ ہربرٹ سپنسر کا کہنا ہے کہ سائنس جزوی طور پر جبکہ فلسفہ کُلی طور پر منظّم علم ہے۔ صحیح/غلط

9:۔ ایمپیڈوکلیز کے خیال میں کائنات چار بنیادی عناصر یعنی جواہر سے مل کر بنی ہے۔ صحیح/غلط

10:۔ جمالیات ہمارے جذبات کے حسن و قبح سے تعلق رکھتا ہے۔ صحیح/غلط

11:۔ فلسفہ میں تنگ نظری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ صحیح/غلط

12:۔ جمالیات میں خوبصورت اور بدصورت اشیا کی قدر و قیمت پر بحث کی جاتی ہے۔ صحیح/غلط

13:۔ منطق استقرائیہ میں عمومی حقائق سے انفرادی حقائق کی طرف جاتے ہیں۔ صحیح/غلط

14:۔ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے لوگوں میں خواہشات میں فرق نئے اور مختلف فلسفوں کو جنم نہیں دیتا۔ صحیح/غلط

15:۔ رسم و رواج کے علم کو بھی اخلاقیات کہا جاتا ہے۔ صحیح/غلط

باب 2

فلسفہ اور مذہب (Philosophy and Religion)

انسان کو زندگی گزارنے کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی لائحہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ طریقۂ کار، نظم یا لائحہ عمل عظیم ہستیوں کا وضع کردہ ہوتا ہے لیکن بہت سے لوگ اَن دیکھی ہستی یعنی خالقِ کائنات پر یقین رکھتے ہیں، اُسی کے احکامات مانتے ہیں اور پیروی کرتے ہیں۔ خدا کے احکامات، ہدایات اور زندگی گزارنے کے طریقے کو مذہب کہا جاتا ہے۔

مذہب ہمیں خدا کا انسان اور کائنات سے تعلق، ماضی کے واقعات، حال اور مستقبل کے لئے رشد و ہدایات اور اعلیٰ زندگی کا شعور عطا کرتا ہے۔ جس کے مطابق معاشرتی، ثقافتی، معاشی اور اخلاقی مسائل حل کیے جاتے ہیں۔

مذہب کی حقیقت کیا ہے؟ مذہب کیوں ضروری ہے؟ مذہبی قوانین میں کیا حکمت و دانائی پنہاں ہے؟ کیا مذہب لوگوں کی ضرورت ہے؟ کیا مذہب خدا کی طرف سے نازل کردہ احکامات پر مبنی ہوتا ہے یا پھر انسان نے خود ایسے اصول وضع کیے ہیں جنھیں مذہب کا نام دیا جاتا ہے؟ یہ تمام ایسے سوالات ہیں جن کے جواب صرف اور صرف فلسفی ہی دے سکتا ہے۔ ذہن میں پیدا ہونے والے دیگر سوالات کی طرح مذہبی موشگافیاں بھی فلسفے ہی کی مدد سے حل کی جاسکتی ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کے عنوان کے تحت وہ تمام موضوعات زیرِ بحث لائے جاسکتے ہیں جو انسان کو خدا اور کائنات سے تعلق پیدا کرنے میں راہیں متعین کرتے ہیں۔ یہ موضوعات ہی خالقِ حقیقی کی ہستی کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ مذہب دراصل وہ لائحہ عمل ہے جس کو اپنا کر انسان ان مسائل کا صحیح اور مناسب حل تلاش کر لیتا ہے جو ہمیشہ اسے فکری اور علمی میدان میں پریشان کئے رکھتے ہیں۔

مشہور فلسفی کانٹ (Kant) کے خیال میں "ہر فریضہ کو خدائی حکم سمجھنا مذہب ہے۔" اس سے مراد یہ کہ ہے تمام اعمال و افعال ایک عظیم ہستی کی رضامندی اور حکم کے مطابق سرانجام دیئے جائیں۔

فریڈرک شیلر (Friedrick Schieler) کے خیال میں "ہر انفرادی شے کو ایک عظیم کل کا جزو سمجھنا اور ہر محدود شے کو لامحدود کا نمائندہ قرار دینا مذہب ہے۔" مذہب کی اس تعریف میں بھی خدا کی بڑائی اور کبریائی کا اقرار کیا گیا ہے اور کائنات کی ہر شے کو اس کا حصہ بتایا گیا ہے۔ ہر شے کو محدود اور خدا کو لامحدود اس کی صفات کی بنا پر کہا گیا ہے۔ "وہ ہر شے پر قادر ہے" کا مفہوم فریڈرک شیلر کی بتائی ہوئی مذہب کی تعریف میں پنہاں ہے۔

ماہر نفسیات ہافڈنگ (Hoffding) کے خیال میں "مذہب اقدار کے ثبات کا نام ہے۔" یعنی مذہب بنی نوع انسان کے لیے ہر مستقل مثبت قدر کی ہمیشگی اور دوام کا دوسرا نام ہے۔ مذہب انسانی اقدار کے قیام اور ان کی حقیقت کو پائیدار بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

مشہور مغربی ماہر نفسیات و مفکر ولیم جیمز (William James). کا خیال ہے کہ "انفرادی اشخاص کے عالم تنہائی کے وہ

جذبات، اعمال اور تجربات جن کی بابت وہ سمجھیں کہ ان کا رشتہ اس شے سے ہے جسے وہ اپنی دانست میں خدا کہتے ہیں، مذہب کہلاتے ہیں۔"

پروفیسر وائٹ ہیڈ (Whitehead) نے ایک جگہ غور وفکر کے حوالے سے لکھا کہ "انسان جو کچھ اپنی ذات کی تنہائی میں کرتا ہے وہ مذہب ہے۔" اور اسی طرح دوسری جگہ وائٹ ہیڈ نے لکھا ہے کہ "مذہب عقیدہ اور ایمان کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان کو اندرونی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔" مزید یہ کہ "مذہب عالمگیر وفا شعاری کا نام ہے۔"

پروفیسر وائٹ ہیڈ کی مندرجہ بالا تینوں تعریفوں میں انسان کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ مذہب کو ماننے والے کی نیت اور اس کے پاک عقیدے کا ذکر کیا گیا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مذہب بندے اور خدا کے آپس میں تعلق سے متعلق عقیدے کا نام ہے۔ اس میں نیک نیتی اور خلوص دل سے بندہ اپنے خدا سے تعلق پیدا کرتا ہے۔

مذہب ایک ایسی ان دیکھی ہستی پر مکمل یقین اور اعتماد کا نام ہے جو ہر شے کی خالق و مالک ہے اور پھر مذہب کو ماننے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس ہستی کو اپنی مشکلات کا مداوا اور عظیم ہستی سمجھے۔ اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور اس کی خوشنودی اور رضا کے مطابق اپنی زندگی ڈھالے۔

ابتدائے زمانہ ہی سے انسان کو مذہب کی ضرورت رہی ہے۔ وہ ہمیشہ سے مذہب کا محتاج رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایمان اور عقیدہ کی نوعیت بدلتی رہی ہے۔ دنیوی علوم انسان کو عقلی موشگافیاں اور جدید سے جدید تر نظریات مہیا کرتے ہیں لیکن قلبی سکون اور اطمینان مذہب کی راہوں پر چل کر ہی حاصل ہوتا ہے۔ مذہبی تجربہ انسان کو ایک ایسی دنیا سے روشناس کراتا ہے جہاں انسانی عقل پہنچ نہیں سکتی۔

ہافڈنگ کا کہنا ہے کہ "انسان کا ایک ایسی قوت پر ایمان جو خارج میں اپنا وجود رکھتی ہے، کے ذریعے وہ اپنے جذباتی تقاضوں کی تسکین اور زندگی کا استحکام چاہتا ہے اور وہ اپنے اس ایمان کا مظاہرہ عبادت سے کرتا ہے۔"

ہافڈنگ کے خیال میں یہ بات پنہاں ہے کہ ایک ہستی ایسی موجود ہے جس سے انسان اپنا جذباتی رشتہ جوڑتا ہے۔ اسی کے سامنے جھکتا اور اسی سے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دعا اور عبادت و پرستش کا سہارا لیتا ہے۔ انسان جب مذہبی عقیدے کو اپناتا ہے تو قدرتی طور پر جذباتی لگاؤ، تمام تر دلچسپیاں، ارادے، خواہشات اور سوچ بچار ایک خاص سمت میں ڈھل جاتی ہیں۔ انسان ہر لمحہ عقیدے کے لیے زندہ رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ زندگی ایک برتر ہستی کی دی ہوئی ہے۔ وقت آنے پر ضرورت کے تحت جس پر خود کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ہمیں اس عظیم ہستی یعنی خدا کا شعور مذہب سے حاصل ہوتا ہے۔ خدا کا مکمل شعور حاصل کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے لیکن اسی کے احکامات اور فرمودات پر کاربند ہو کر انسان ایک مخصوص طرز حیات کو اپنا لیتا ہے۔ انسان محدود ہے اور خدا لامحدود ہے اس لیے لامحدود کی صفات کو کوئی محدود شے مکمل طور پر پا نہیں سکتی لیکن اس پر اعتقاد، اعتماد اور بھروسہ کرنا ہی اس کو جاننا ہے اور یہی صحیح راستہ ہے جسے مذہبی راستہ کہا جاتا ہے جو کہ نجات اور فلاح کی راہ ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب خوف کا نتیجہ ہے یعنی مختلف آفاقی مشکلات انسان کو خوفزدہ کر دیتی ہیں۔ بعض حوادث ایسے

ہوتے ہیں جن کے اسباب کا انسان کو پتہ نہیں چلتا مثلاً بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، طوفانِ باد و باراں، زلزلے، وبائی امراض اور ناگہانی مشکلات سے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کچھ بڑی بڑی طاقتیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ اس طرح خوفزدہ انسان کے دل میں مذہب کا تصور ابھرتا ہے۔

بعض کا یہ کہنا ہے کہ حیرت و استعجاب سے مذہب کی ابتدا ہوئی ہے۔ بلند پہاڑ، عجیب وغریب نظارے اور انسان کو بے بس کرنے والے واقعات اسے حیرت میں ڈال دیتے ہیں جس سے اس کے ذہن میں مذہب کا تصور جنم لیتا ہے۔

انسان ان آفاقی مشکلات، بے بس کر دینے والے واقعات، وبائی امراض اور ناگہانی مشکلات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔ اس طرح اس کے ذہن میں خدا اور دیوی دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

جدید مفکر شوپنہار (Schopenhauer) کا کہنا ہے کہ "مذہب موت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔" جبکہ برگساں (Bergsan) کا خیال ہے کہ "جب عقل نے کہا کہ مرگ ناگزیر ہے تو فطرت نے ایک مدافعانہ ردِعمل اختیار کیا۔ اسی کا نام مذہب ہے۔"

حقیقت میں مذہب ایک مقدس راستے پر چلنے کا عمل ہے۔ جس شے کو انسان بلند ترین قرار دے اس سے تعلق کا نام مذہب ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب انسان کے لیے ایک ایسا سہارا ہے جس کی مدد سے وہ رنج والم سے نجات حاصل کرتا ہے اور خوشگوار زندگی گزارتا ہے۔ مذہب انسانی زندگی کو باضابطہ بناتا ہے۔ بے ترتیب اور بے ہنگم مصروفیات کو ترتیب دیتا ہے۔ انسان اس طرح اطمینان قلب سے ہر لحہ اپنے آپ کو اس ہستی کی خوشنودی کے لیے وقف کر دیتا ہے جو سب کچھ عطا کرتی ہے۔ مذہب کی مدد سے وہ ہر دن کا آغاز خدا کو اپنا ہمدرد اور مددگار تصور کرتے ہوئے کرتا ہے۔

مذہب ہی انسان کو سکھاتا ہے کہ ایک ایسی عظیم ہستی پر یقین قائم کیا جائے جو اس کی دعاؤں کو سنتا ہے اور مشکلات کو حل کرتا ہے۔ دعا سے انسان اپنے کردار میں تبدیلی پیدا کرتا ہے اور ہر دعا میں ایک ایسی ہستی سے مانگنے کا تصور پایا جاتا ہے جو اعلیٰ و برتر ہے جسے خدا کہتے ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ کے خیال میں انسانی روح حقیقتِ مطلقہ سے گہرا رابطہ چاہتی ہے۔ یہ رابطہ عقل سے نہیں بلکہ خدا پر ایمان اور دعا سے پیدا ہوتا ہے۔ دعا سے روح کے اندر روشنی اور قوت کا احساس ابھرتا ہے۔ انسان کا اعتماد بحال ہوتا ہے۔

عقل انسان کو استدلال، سوچ و بچار اور تفکرات کی دنیا میں لے جاتی ہے جبکہ مذہب اسے ایمان کی روشنی دیتا ہے جس میں عقلیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وائٹ ہیڈ (Whitehead) کا کہنا ہے کہ جس زمانے میں مذہب کا زور ہوتا ہے اس دور میں عقلیت کا بھی زور ہوتا ہے۔ اس کی اہم وجوہات ہیں۔ مثلاً جب لوگ اپنے ذہنی اعمال خصوصاً اعتقادات، جذبات، ارادے اور احساسات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف مذہب بغیر کسی دلیل کے اعتقادات اور جذبات کے تجربے پر زیادہ اصرار کرتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں عقلیت اپنے عروج پر ہوتی ہے اس زمانے میں مذہب کا بھی زور ہوتا ہے۔

مذہب اور اخلاقیات میں تعلق (Relation Between Religion and Ethics)

عقل ہمیشہ تجزیہ اور تحلیل سے فکری مسائل کا حل چاہتی ہے لیکن مذہب میں ہر بات کا تجزیہ کرنے کے بجائے ایمان پر زور دیا جاتا ہے۔ خیر و شر کے معاملات کی وضاحت مذہب میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ مذہب اور اخلاقیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ انسان مذہب کی مدد سے زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے جو لائحہ عمل تیار کرتا ہے اسے اخلاقیات کہتے ہیں۔

فلسفہ اور مذہب کے اہم موضوعات/سوالات اور ان کا حل

فلسفہ سوچ و فکر کا نام ہے، جبکہ مذہب انسان اور خدا کا آپس میں تعلق ایمان کے ذریعے قائم کرنے کا ہے۔ دونوں میں متعدد موضوعات مشترک ہیں اور چند ایک نکات پر اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

فلسفہ اور مذہب میں پائے جانے والے مشترک موضوعات یا سوالات میں سب سے اہم یہ ہیں۔ یہ کائنات کیا ہے؟ اور اس کا خالق کون ہے؟ فلسفے میں تکوین کائنات کی وجہ عقل و دلیل سے تلاش کی جاتی ہے اور تخلیق کرنے کی علت ہی اس کی حقیقت ہے۔ جبکہ مذہب دلیل و استدلال کے بجائے بلاواسطہ کائنات کی تخلیق کی وجہ یعنی خالق کائنات صرف اور صرف خدا کو مانتا ہے۔

چینی، ہندی، مصری، ایرانی، یونانی اور جدید فلسفہ میں خدا کے وجود کے متعدد دلائل دیئے گئے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ مسلم فلسفیوں نے بھی فلسفیانہ انداز سے خدا کی حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ حقیقتاً خدا کو دلائل سے ثابت کرنا خود تردیدی مفروضے قائم کرنے کے مترادف ہے۔ خدا کے تصور کا تعلق صرف اور صرف ایمان سے ہے۔ جب انسان بغیر دلیل کے مذہب کی روشنی میں خدا کو مان لیتا ہے تو پھر تمام عقلی بحثیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفے کو مذہب کے مقابل کھڑا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مذہب خیر کل اور حقیقت اولیٰ کی صفات والی ہستی کو خدا کہتا ہے جسے فلسفیانہ افکار کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا۔

خالق کائنات فلسفہ اور مذہب کا مشترک موضوع ضرور ہے لیکن اس تک پہنچنے کا طریق کار مختلف ہے۔

فلسفہ اور مذہب دونوں انسان کو علم حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ علم کیسے حاصل کرنا چاہیے؟ علم کیا ہے؟ علم کے مآخذ کون کون سے ہیں؟ علم کی حقیقت کیا ہے؟ فلسفہ اور مذہب میں علم سے متعلق یہ تمام سوالات مشترک ہیں لیکن دونوں میں علم حاصل کرنے اور علم کی حدود مختلف ہیں۔ فلسفے میں بنیادی طور پر عقل، دلیل، استدلال اور سوچ و بچار سے علم حاصل کیا جاتا ہے جبکہ مذہب میں علم وجدان اور الہام سے حاصل کیا جاتا ہے۔ فلسفہ غیر حتمی اور مشروط علم تک پہنچتا ہے جبکہ مذہب حتمی علم فراہم کرنے کا دعوے دار ہے اور اس کی بنیاد ایمان، اعتقاد، وجدان اور وحی پر ہوتی ہے۔

انسان کی ابتدا کیسے ہوئی؟ انتہا کیا ہے اور یہ کائنات کیا ہے؟ فلسفہ اور مذہب دونوں کے اہم سوالات ہیں۔ فلسفہ عقلی بنیادوں پر طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کی مدد سے انسان کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتا ہے جبکہ مذہب خدا کے فرمان اور ایمان و یقین کے مراحل طے کرتا ہوا انسان سے متعلق تمام سوالات کے جواب مہیا کرتا ہے۔

چند اور سوالات مثلاً خدا اور انسان کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ کائنات اور خدا کا کیا تعلق ہے؟ بھی فلسفہ اور مذہب ہی کے سوالات ہیں۔ انسان، کائنات اور خدا ایسے تصورات ہیں جن کے بارے میں فلسفے میں عقلی دلائل سے بحث کی جاتی ہے۔ جبکہ مذہب خدائی احکام، فرمان اور کلام سے ان سوالات کے جواب فراہم کرتا ہے۔

روح کیا ہے؟ فلسفہ کے اکثر مکاتب فکر میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ قرآن میں روح کو امر ربی کہا گیا ہے یعنی خدا کا حکم۔ آزادیٔ ارادہ کیا ہے؟ کیا مخلوق خصوصاً انسان آزاد ہے یا مجبورِ محض؟ اور اگر مجبور ہے تو کن بنیادوں پر؟ کبھی فلسفہ مذہب کے زیر اثر رہا ہے اور کبھی فلسفہ مذہب سے آزاد ہو جاتا ہے۔ بعض قوموں اور ادوار میں مذہبی مسائل پر گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن اس کے باوجود فکری سطح پر مذہب کے بارے میں فلسفیانہ مباحث جاری رہیں۔ اسلام کے عروج کے زمانے میں اشاعرہ، معتزلہ، ابن سینا، ابن رشد، امام الغزالی اور ابن خلدون وغیرہ مذہب کے مختلف موضوعات و مسائل کا فکری اور تنقیدی تجزیہ کرتے رہے ہیں۔ جدید دور کے مفکرین کا بھی یہی نقطہ نظر ہے کہ مذہب کی حکمت جاننا ضروری ہے۔

مذہب اور فلسفہ میں فرق (Difference Between Religion and Philosophy)

فلسفہ ذہنوں کو جلا بخشتا ہے۔ زندگی کے مختلف النوع مسائل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ (Mathew Arnold) کے خیال کے مطابق مذہب جذبات آمیز اخلاق کا نام ہے۔ اسی طرح ایچ۔ ایچ۔ ٹائٹس (H.H. Titus) کا نقطہ نظر ہے کہ "بغیر مذہب کے اخلاقیات گرمی عمل سے نا آشنا رہتی ہے اور سرد پڑ جاتی ہے۔ جب مذہب کا اخلاقی اغراض سے کوئی واسطہ نہ رہے تو وہ بداخلاقی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اپنی بہت کچھ اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔"

مذہب اور فلسفہ ایک دوسرے سے منسلک اور مربوط ہونے کے باوجود بعض مقامات پر اختلافات بھی رکھتے ہیں۔ انہی اختلافات کی بنا پر مذہب کی اپنی خصوصی اور اہم شناخت ہوتی ہے۔ یہ شناخت ہی مذہب کو فلسفے سے الگ نظام میں تقسیم کر دیتی ہے۔ مذہب اور فلسفہ میں اختلاف درج ذیل چند نکات پر پایا جاتا ہے:

1۔ **نظری اور عملی فرق**:۔ فلسفہ خالصتاً نظری علم ہوتا ہے۔ فلسفے میں تفکرات اور نظریات بیان کئے جاتے ہیں جبکہ مذہب میں نظریہ کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ عمل کے بغیر مذہبی نظریات اور تفکرات کی کوئی الگ حیثیت نہیں۔ خدا پر ایمان لانا اور اس کے احکامات کو ماننا مذہب کا اہم مسئلہ ہے۔ جس سے انسان کی حقیقی فلاح اور مسرت کا حصول ہوتا ہے۔

2۔ **فرائض کی ادائیگی**:۔ فلسفہ میں تجزیہ و ترکیب کے ذریعے جدید افکار پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس میں انسان پر کسی قسم کے فرائض لاگو نہیں ہوتے لیکن مذہب میں فرائض ادا کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔ مذہبی فرائض خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے لازمی ہیں جبکہ فلسفہ میں ایسی کوئی صورت حال نہیں ہوتی۔ مذہب میں احساسات اور جذبات کا بے حد عمل دخل ہوتا ہے جن کی بنا پر فرائض ادا کئے جاتے ہیں۔ انسان ایسا کر کے اپنے آپ کو بہتر اور محفوظ محسوس کرتا ہے۔

3۔ **مرکزی حیثیت**:۔ مذہب میں مرکزی حیثیت خدا کو حاصل ہوتی ہے۔ خدا کے دیئے ہوئے احکامات اور ہدایات پر عمل کیا جاتا ہے لیکن فلسفہ میں مرکزی حیثیت فلسفیانہ استدلال کو حاصل ہوتی ہے۔ فلسفیانہ افکار سے مزید افکار جنم لیتے ہیں۔ اس میں کسی

کے احکامات پر عمل کرنے کی تلقین نہیں کی جاتی۔

4- یک رنگی:۔ مذہبی احکامات صرف ایک ہی انداز کے ہوتے ہیں یعنی کسی ایک موضوع پر ایک ہی نقطہ نظر بیان کیا جاتا ہے۔ اس کو صرف ماننا ہوتا ہے۔ ردّ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا لیکن فلسفہ میں ایک ہی موضوع پر مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک فکر کو رڈ کر کے نیا فکر پیش کر دیا جاتا ہے، اس طرح بعض اوقات ایک ہی عنوان یا موضوع کو مختلف فلسفیوں نے بیک وقت مختلف انداز میں الگ الگ بیان کیا ہے جبکہ مذہب میں افکار کی یک رنگی پائی جاتی ہے۔ ایک مذہبی فکر یا حکم جب خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے تو پھر اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اس کو سمجھنے میں اپنی اپنی عقل کے مطابق انسان مختلف انداز اپنا سکتے ہیں لیکن خدا کے حکم کو تبدیل یا رڈ نہیں کر سکتے۔

5- انحصار:۔ فلسفہ کے افکار کا انحصار کلی طور پر عقل واستدلال پر ہوتا ہے جبکہ مذہب کا انحصار وحی پر ہے۔ عقل اور وحی دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ وحی پیغمبر پر خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے لیکن عقلی استدلال انسانی تفکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

6- ایمان:۔ مذہب ایمان محکم پر مبنی ہوتا ہے جبکہ فلسفہ جائزہ، تجزیہ، ظن وتخمین اور سوچ وبچار پر منحصر ہوتا ہے۔

7- تسلیم ورضا:۔ مذہب میں وحی سے حاصل شدہ احکامات کی صداقت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جبکہ فلسفہ عقل کے ذریعے قائم کردہ افکار کا تجزیہ کرتا ہے اور تنقید کر کے ردّ وقبول کے عمل سے گزارتا ہے۔ اس کی صداقت اور حقیقت کی تصدیق کرتا ہے یا تردید۔

8- روحانی پہلو:۔ مذہب میں انسان اور کائنات کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے کیونکہ اخلاقی احکامات پر عمل کر کے انسان روحانی میدان میں آسودگی حاصل کرتا ہے۔ اُسے اطمینان قلب اور سکون میسر آتا ہے جبکہ فلسفہ میں تشکیک کو اپنایا جاتا ہے۔ عقل ودانش کی بنیاد پر فلسفیانہ افکار قائم کیے جاتے ہیں اور ان کی عقلی توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔

9- جذبات واحساسات:۔ مذہبی احکامات میں جذبات واحساسات کا بے حد عمل دخل ہوتا ہے۔ خدا پر ایمان اور اس کی خوشنودی ورضا مندی کے لئے عبادات میں مذہبی جذبات کا اہم کردار ہوتا ہے۔ جذبات واحساسات کی تسکین ہوتی ہے۔ لیکن فلسفہ میں افکار ونظریات کو عقلی استدلال پر پرکھا جاتا ہے۔ اس میں کسی کی خوشنودی یا جذبات کی تسکین درکار نہیں ہوتی۔

10- اساس:۔ مذہب کی اساس بعض نظریات وعقائد پر ہوتی ہے۔ انہی پر مذہب کی پوری عمارت تعمیر کی جاتی ہے جبکہ فلسفہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ فلسفہ کسی بھی نقطہ نظر کو محض فرض کر کے آگے نہیں بڑھاتا۔ بغیر عقلی دلائل اور شواہد کے کسی فکر کو تسلیم نہیں کرتا۔ یعنی مذہب اور فلسفہ دونوں کی اساس یا بنیاد میں فرق ہے۔

11- ہم آہنگی:۔ کائنات میں پائی جانے والی ہم آہنگی کو مذہب واضح کرتا ہے جبکہ فلسفہ کائنات میں موجود تضادات سے حقائق کا پتہ لگاتا ہے۔ اس طرح فلسفہ میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔

علامہ محمد اقبالؒ کا تصورِ مذہبی شعور

علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے فلسفیانہ افکار میں مذہبی شعور کا تصور پیش کیا ہے۔ جس کی تین سطحیں بیان کی گئی ہیں۔

1:۔ اعتقاد (Belief)

2:۔ تفکر (Thought)

3:۔ معرفت (Discovery)

1-اعتقاد:۔ علامہ محمد اقبالؒ کے تصور مذہبی شعور کی پہلی سطح اعتقاد بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہ مذہب کو جاننے کی بنیادی سطح ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اعتقادات کے ظاہری پہلوؤں کو مذہبی شعور کی بنیادی اور پہلی سطح اس لئے کہا ہے کیونکہ مذہب میں فرض کو فرض سمجھ کر ادا کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو صرف اور صرف عقیدہ کی سطح تک ہی رہتے ہیں۔ ہر حالت میں عبادات سے متعلق احکام کو پورا کرتے ہیں۔توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو اپنانے کی عملی کوشش کرتے ہیں۔ خشوع وخضوع کے ساتھ اعتقاد کے تمام مراحل کو اپناتے ہیں۔ان کے بارے میں سوچ وبچار یا سوالات نہیں کرتے کیونکہ ان کی اپنی سطح صرف اور صرف اعتقاد تک ہی محدود ہوتی ہے۔ بعض اوقات اگر کوئی دوسرا سوالات اٹھائے تو اس کو بھی نہیں مانتے، وہ اپنی دھن میں مگن اعتقاد کے مطابق زندگی گزارتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی معاملات میں عقلی دلائل سے کام لینا اور ان کے بارے میں سوالات کرنا گمراہی ہے۔ چنانچہ ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً نماز کے قائم کرنے کے بارے میں قرآن مجید میں بار ہا تاکید کی گئی ہے۔ اس لئے اس پر یہ سوچنا کہ نماز کیوں پڑھی جائے، ان کے نزدیک بے سود ہے۔ صرف اس حکم کو مانا جاتا ہے کہ نماز پڑھنی چاہیے اور جان بوجھ کر نماز ترک نہ کی جائے۔

2- تفکر:۔ علامہ محمد اقبالؒ کے خیال کے مطابق مذہبی شعور کی دوسری سطح تفکر کی ہے۔ اہل دانش اور فلسفی حضرات مذہبی احکام اور عقائد کی حکمت جاننا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب کا کوئی حکم بغیر حکمت ودانائی نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ جاننا ضروری ہے کہ کوئی حکم کیوں نافذ کیا گیا ہے؟ اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کیا ہے؟ اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ عقائد کے بعد دوسری اہم سطح تفکر یعنی سوچ وبچار اور عقل و دانش کی ہے۔ مذہبی عقائد کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ قرآنی آیات واحکام کی تشریح کی جاتی ہے۔ تفاسیر لکھی جاتی ہیں۔ خطبات دیئے جاتے ہیں۔ مختلف مثالوں سے مذہبی عقائد واحکامات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ مذہبی شعور کے بغیر مذہب کی حقیقت کا پتا نہیں چل سکتا۔ اندھے اعتقاد سے آگے بڑھ کر سوچ وبچار تک پہنچا جاتا ہے۔ سوچ وبچار ہی سے انسانی علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ محض لکیر کا فقیر نہیں بنا جاتا بلکہ مذہبی شعور کی دی ہوئی حقیقتوں کا صحیح انداز سے اعلیٰ سطح پر ادراک حاصل کیا جاتا ہے۔

تفکر کی اس سطح پر انسان جملہ شرعی احکام اور نظام کے ساتھ عقیدے کا ربط وتعلق معلوم کرتا ہے۔ لیکن اس میں ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ غور وفکر کرتے ہوئے اصل عقیدے سے نہ ہٹا جائے۔ مبادا عقلی بنیادیں تلاش کرتے ہوئے کہیں موضوع یا خدائی حکم کی بنیاد نہ بدل جائے۔ اس لئے مذہبی شعور کی اس دوسری سطح پر انسان کو مذہبی احکامات کو جاننے کے لئے بڑی سمجھ داری

اور احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

3- **معرفت:**۔ علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک مذہبی شعور کی تیسری اہم سطح معرفت یا انکشاف کی ہے۔ اس سطح پر انسان باطنی روشنی اور احساسِ طمانیت حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کی اساس روحانی تجربے پر ہوتی ہے۔ جب انسان اعتقاد کی سطح کے بعد تفکر سے آگے گزر جاتا ہے تو وہ خدا کو پالیتا ہے۔ اسے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہی مذہبی انسان کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے۔ معرفت یا کشف کی سطح صوفیاء کرام کے ساتھ مخصوص ہے۔

فلسفے کی حاصل کردہ فکری اساس مذہبی بصیرت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر انسان خدا کی خوشنودی اور رضا مندی حاصل کرتا ہے لیکن جب وہ معرفت اور کشف پاتا ہے۔ خدا کی قدرت کو قریب سے دیکھتا ہے۔ اس کا اعتقاد بھی پختہ ہوتا ہے اور یقین بھی کامل ہو جاتا ہے۔ یہی مذہبی شعور کی تیسری اہم اور خصوصی سطح ہے جو معرفت الٰہی اور الوہی حقائق کا پتہ دیتی ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ نے ایک عارف وزاہد کا قول بیان کیا ہے کہ قرآن کی تلاوت یوں کرو جیسے یہ خود تم پر نازل ہو رہا ہے۔ لیکن یہ منزل ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی صرف خدا کے خاص بندوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

فلسفہ صرف سوچ بچار کا نام لینا ہی نہیں بلکہ یہ زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق علوم سے تعلق بھی پیدا کرتا ہے۔ چونکہ فلسفیانہ بنیادیں عقلی ہوتی ہیں۔ اس لیے اس میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ سوچ و بچار، حکمت و دانائی اور فلسفیانہ طریق کار ہی سے سمجھے جاسکتے ہیں۔ چونکہ مذہب کی بنیاد وحی اور فلسفہ عقلی استدلال پر مبنی ہے اس لئے اس اہم فرق کی بنا پر دونوں میں اختلاف فطری ہے اور دونوں کی الگ الگ شناخت کا باعث ہے۔ مذہب کا آخری اور اعلیٰ سطح کا ماخذ علم وحی ہے۔ اس طرح فلسفہ ادراک، عقلیت اور تجربیت کی راہ اپناتا ہے جبکہ مذہب وجدان اور وحی کے ذریعہ معرفت اور انکشاف کی منازل طے کرتا ہوا نئے اسرار منکشف کرتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ عام شخص کی نسبت فلسفی مذہب کا شعور بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ انکشاف اور معرفت کی سطح تک پہنچنے کے لئے پہلی دو سطحوں عقیدہ اور تفکر سے لازمی گزرنا پڑتا ہے۔ کوئی صوفی اگر عقیدہ اور تفکر نہیں رکھتا، وہ معرفت تک نہیں پہنچ سکتا یہ بات ہمیں فلسفیانہ غور وفکر سے ہی معلوم ہوتی ہے۔

سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1:۔ مذہب سے کیا مراد ہے؟

2:۔ فلسفہ اور مذہب میں کیا مشترک ہے؟

3:۔ فلسفہ اور مذہب کا آپس میں فرق بیان کریں۔

4:۔ علامہ محمد اقبالؒ کا تصور مذہبی شعور واضح کریں۔

معروضی طرز (Objective Type)

سوال 1:۔ مناسب اور ضروری اصطلاحات یا الفاظ سے خالی جگہ پر کریں۔

1:۔ علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک مذہبی شعور کی دوسری سطح .... ہے۔

2:۔ علامہ محمد اقبالؒ کے خیال میں مذہبی شعور کی تیسری سطح .... ہے۔

3:۔ علامہ محمد اقبالؒ کے خیال میں مذہبی شعور کی پہلی سطح .... ہے۔

4:۔ ہر فریضہ کو خدائی حکم سمجھنا مذہب ہے" یہ خیال مشہور فلسفی .... کا ہے۔

5:۔ "مذہب اقدار کے ثبات کا نام ہے۔" یہ ماہر نفسیات .... کا خیال ہے۔

6:۔ شوپنہار کا خیال ہے کہ مذہب .... کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔

7:۔ "بغیر مذہب کے اخلاقیات گرمیٔ عمل سے نا آشنا رہتی ہے" یہ .... کا نقطہ نظر ہے۔

8:۔ فلسفے کا انحصار کلی طور پر عقل و استدلال اور مذہب کا انحصار .... پر ہے۔

9:۔ "انسان جو کچھ اپنی تنہائی میں کرتا ہے وہ مذہب ہے" یہ خیال .... کا ہے۔

10:۔ جس دور میں مذہب کا زور ہوتا ہے اس میں عقلیت کا زور بھی ہوتا ہے۔" یہ خیال .... کا ہے۔

سوال 2:۔ ذیل میں سوالات کے ممکنہ جواب دیئے ہوئے ہیں صحیح جواب کی نشاندہی کریں۔

1:۔ خدا کے احکامات، ہدایات اور زندگی کے لائحہ عمل کو کہا جاتا ہے۔

1۔فلسفہ 2۔مذہب 3۔قانون 4۔کائنات

2:۔ یہ کس نے کہا تھا۔"ہر فریضہ کو خدائی حکم سمجھنا مذہب ہے۔"

1۔برگساں 2۔علامہ اقبالؒ 3۔امام الغزالیؒ 4۔کانٹ

3:۔ یہ کس فلسفی نے کہا تھا۔"ہر انفرادی شے کو ایک عظیم کل کا جزو سمجھنا اور ہر محدود شے کو لامحدود کا نمائندہ قرار دینا مذہب ہے۔"

1۔فریڈرک شیلر 2۔الکندی 3۔کانٹ 4۔افلاطون

4:۔ "مذہب اقدار کے ثبات کا نام ہے۔" یہ کس کا نقطہ نظر ہے۔

1۔ہافڈنگ 2۔ارسطو 3۔علامہ محمد اقبالؒ 4۔یا کوئی نہیں

5:۔ "مذہب عقیدہ کی اس قوت کا نام ہے۔ جس سے انسان کو اندرونی پاکیزگی حاصل ہوجاتی ہے۔" یہ کس کا خیال ہے۔

1۔جان لاک 2۔ہیگل 3۔وائٹ ہیڈ 4۔الفارابی

6:۔ وائٹ ہیڈ کے خیال میں جس زمانے میں مذہب کا زور ہوتا ہے۔ تو اس زمانے میں مزید کس کا زور ہوتا ہے۔

1۔عقلیت 2۔تجربیت 3۔خاموشی 4۔جذبات

7:- عقل تجزیہ اور تحلیل سے کام لیتی ہے لیکن مذہب میں تجزیہ کے بجائے ہوتا ہے۔

1۔ایمان 2۔اقدار 3۔اخلاق 4۔دلیل

8:- فلسفہ اور مذہب دونوں میں بعض جگہ پایا جاتا ہے۔

1۔فرق 2۔وجدان 3۔آزادی 4۔کچھ نہیں

9:- فلسفہ اور مذہب کے درمیان جہاں فرق پایا جاتا ہے۔ وہاں دونوں میں بعض موضوعات ہوتے ہیں۔

1۔مشترک 2۔اعتقادات 3۔حسی علوم 4۔تخلیقات

10:- علامہ محمد اقبالؒ کے تصورِ مذہبی شعور کی سطحیں ہیں۔

1۔ایک 2۔دو 3۔تین 4۔چار

سوال3: کالم "الف" اور کالم "ب" میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کرکے جواب کالم "ج" میں درج کریں۔

کالم "الف"	کالم "ب"	کالم "ج"
☆ مذہب	کا نام ہے۔	
☆ خدا کا تعلق	سمجھنا مذہب ہے۔	
☆ مذہب اقدار کے ثبات	زندگی کا لائحہ عمل ہے۔	
☆ ہر فریضہ کو خدائی حکم	عقلیت کا بھی زور ہوتا ہے۔	
☆ مذہب کا زور ہو تو	انسان اور کائنات سے۔	
☆ روح	کی تین سطحیں ہیں۔	
☆ مذہب اور فلسفہ میں	کو انکشاف کہتے ہیں۔	
☆ علامہ محمد اقبالؒ کے تصورِ مذہبی شعور	امرِ ربی ہے۔	
☆ معرفت	تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔	
☆ خدا کے حکم کو	فرق بھی پایا جاتا ہے۔	

فلسفہ اور سائنس (Philosophy and Science)

سائنس کی تفہیم

سائنس کے معنی علم کے ہیں۔علم کا مطلب جاننا ،واقفیت حاصل کرنا ہے۔دوسرے الفاظ میں انہی اشیا کو جاننے کی کوشش کی جاتی ہے جو مبہم اور غیر واضح ہوتی ہیں۔علم سے مراد اشیا کے راز جاننا اور ابہام کو دور کر کے واضح اور صاف کرنا ہوتا ہے۔سائنس سے مراد جامع معلومات کا ایسا مجموعہ ہے جنہیں غیر جانبداری سے اکٹھا کیا گیا ہو۔انہیں منظم طریقے سے مرتب کیا گیا ہو۔اس طرح یہ مختلف واقعات، مظاہرات اور تجربات کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی وضاحت کرتا ہے اور ان سے مفید نتائج اخذ کرتا ہے۔

علوم کی عمومی طور پر دو قسمیں ہیں: طبعی علوم (Natural Sciences) اور معیاری علوم (Normative Sciences)۔طبعی علوم کا تعلق حقائق (Facts) سے ہے۔طبعی علوم مشاہدے اور تجربے کی بنا پر مظاہر فطرت کی حقیقت اور ان کے متعلق قوانین وعلتی رشتے (Causal Relations) وضع کر کے ان کی تشریح کرتے ہیں۔طبعی علوم کی حیثیت بیانیہ (Descriptive)، تحلیلی (Analytic) اور تشریحی (Explanatory) ہے۔طبعیات، ارضیات ،نباتیات،اور حیوانیات وغیرہ طبعی علوم ہیں ان کا کام اس بات کی تحقیق کرنا ہے کہ فلاں شے کیسی ہے ؟اس کی کیا صفات ہیں؟ وہ کیسے واقع ہوتی ہے۔؟ کیا؟ کیسے؟اور کتنی مقدار؟جیسے سوالات کا جواب تلاش کرتے ہیں۔اس لئے سائنس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ سائنس کسی موضوع کے متعلق صحیح مربوط اور مکمل واقفیت فراہم کرنے کا نام ہے۔

ووڈ ورتھ (Wood Worth) کے خیال کے مطابق سائنس کوئی نئی شے دریافت نہیں کرتی بلکہ سائنس جس حقیقت کو دریافت کرتی ہے وہ پہلے سے موجود ہوتی ہے۔مگر انسان اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتا۔اس طرح سائنس کا مقصد صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھانا ہے جو پہلے موجود ہے۔سائنسی مفروضات اور تفکرات کسی شے کے وجود کے بارے میں ہوتے ہیں۔اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس شے کا وجود نہ ہو وہ سائنس کی دسترس میں نہیں آسکتی۔یعنی وہ سائنس نہیں ہوسکتی۔

کائنات میں مظاہر قدرت کے مربوط مطالعہ کو سائنس کہتے ہیں۔اس لئے سائنس کی مکمل تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ سائنس سے مراد وہ منظم، مکمل، مربوط اور جامع علم ہے جو کائنات کے کسی مخصوص گوشے کے حقائق کے مشاہدے پر مبنی ہو۔

جدید فلسفی ہنری برگساں (Henri Bergsan) کا خیال ہے کہ ہمارا بیشتر علم بے حد خیالی اور سطحی ہوتا ہے۔ہم اپنے تجربات کو بیان کرنے کے لئے علامات استعمال کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ مکمل طور پر صحیح نہیں ہوتا۔سائنس کی بنیاد حقیقتاً علامات پر مبنی ہے۔ اور یہ فطرت کو قوانین کے تابع سمجھتی ہے۔لیکن سائنس فطرت کی حقیقت کی وضاحت کرنے سے قاصر ہے جو مسلسل حرکت میں ہے

اور محض قوانین تحلیل کے ہی تابع نہیں ہے۔

سائنس میں بتدریج تحقیق ہوتی ہے لیکن حقیقی طور پر فلسفہ ہی سائنس کو بنیادیں مہیا کرتا ہے۔ غور وفکر ہی کی وجہ سے سائنس پروان چڑھتی ہے۔ مثلاً یونانی فلسفی ڈیموکرائٹس نے کئی ہزار سال قبل یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ مادہ کو چھوٹے سے چھوٹے ذرے میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں مادہ کی تقسیم نہیں ہوسکتی اس کو ایٹم (Atom) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد 1808ء میں جان ڈالٹن نے نظریہ ایٹم (Atomic Theory) کی نشوونما کی۔ جس میں ایٹم کے وجود کی حیثیت اور ہیئت بیان کی گئی۔ اس طرح یونانی فلسفی ڈیموکرائٹس کی مہیا کردہ فلسفیانہ بنیاد پر جدید نظریہ ایٹم یہ ہے کہ جدید دور میں مادے کو چھوٹے چھوٹے ذرات میں تقسیم کرسکتے ہیں حتیٰ کہ یہ تقسیم لامحدود ہو جاتی ہے۔ نیوٹران، پروٹان اور الیکٹران سے آگے ایٹم کو سو (۱۰۰) سے زیادہ جزیات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک جوہر کے چھوٹے سے چھوٹے جز کو ایٹم (Atom) کہا جاتا ہے۔ جن میں بعض کی حیثیت آزاد ہوتی ہے اور بعض کی آزاد نہیں ہوتی۔ مثلاً ہیلیم (Helium) اور نیون (Neon) گیسوں (Gases) کے ایٹم کی حیثیت آزاد ہے۔ جبکہ ہائیڈروجن (Hydrogen)، نائیٹروجن (Nitrogen) اور آکسیجن (Oxygen) گیسوں (Gases) کی حیثیت آزاد نہیں ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ یونانی فلسفی ڈیموکرائیٹس کے مہیا کردہ نظریہ پر بتدریج تحقیق کے ذریعے سائنس نے ترقی کی ہے۔

دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اتفاقی نہیں ہوتے بلکہ ان واقعات کی کوئی نہ کوئی علت یعنی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے سائنس کی دنیا میں اتفاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں ہر شے، ہر واقعہ اور ہر حادثہ، علت یا وجہ ضرور رکھتا ہے۔ یعنی علت و معلول کا رشتہ ہی سائنس کے لئے بنیاد مہیا کرتا ہے۔ معروف سائنسدان آئین سٹائن (Einstein) نے صرف چھبیس سال کی عمر میں حیران کن سائنسی نظریات پیش کئے۔ 1543ء میں کوپرنیکس (Copernicus) نے ثابت کیا کہ زمین محض ایک سیارہ ہے جو سورج کے گرد محوِ گردش ہے۔ 1687ء میں نیوٹن (Newton) کی شہرہ آفاق تصنیف "Principia Mathematica" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں نیوٹن نے قوانین حرکت پیش کئے۔ ان قوانین کی دریافت نے انسان پر علم و عمل کی نئی راہیں کھول دیں۔ جن پر چل کر وہ فطرت کی قوتوں کو سمجھ سکا اور نئی ایجادات اور دریافتوں کا باعث ہوا۔ آئین سٹائن کا نظریہ اضافیت اور میکس پلانک کے کوانٹم نظریہ نے بھی سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔

قدرتی قوانین کا انکشاف ہی دراصل سائنس کی دریافت ہے۔ مشاہدات و تجربات کی مدد سے حقائق کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ پھر نتائج اخذ کر کے اصول و قوانین وضع کئے جاتے ہیں۔ یہی سائنس کے اصول و قوانین کہلاتے ہیں۔ ان قوانین کی مدد سے مظاہر فطرت کے بارے میں علوم مرتب کئے جاتے ہیں۔

سائنسی مطالعہ میں جزوی مشاہدہ، بالواسطہ اور بلا واسطہ مشاہدہ کے لئے مختلف حقائق اور شواہد کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ کائنات میں موجود اشیا کی مناسبت سے سائنسی علوم ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ بتدریج ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جمادات سے متعلق علم جمادات (Geology)، نباتات سے متعلق علم نباتات (Botany)، حیوانات سے متعلق علم حیوانات

(Zoology)، انسانوں سے متعلق علم طب (Medical Science) اور علم نفسیات (Psychology) سائنسی علوم کہلاتے ہیں۔ ان سب میں جزوی انداز سے تحقیق کر کے کلی طور پر رائے قائم کی جاتی ہے۔ یہی رائے سائنسی حقائق یا علوم کی بنیاد بنتی ہے۔ یہ علوم تجربہ اور مشاہدہ سے حاصلِ نتائج اور تنظیمِ نتائج کے مراحل طے کر کے ترویج و ترقی کرتے ہیں۔ یہی سائنسی طریقہ کار ہے۔

سائنسی اندازِ فکر

سائنسی اندازِ فکر میں تحقیقی اور تخلیقی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ کسی بھی موضوع یا مسئلہ کا گہرائی میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔ حقیقت جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسئلے کی نوعیت کا ادراک اس وقت ممکن ہوتا ہے جب متعلقہ مفروضوں کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے۔ سائنسی اندازِ فکر کا درج ذیل عنوانات کے تحت مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(1) حقائق معلوم کرنا (2) اشیا کا مشاہدہ کرنا (3) نئے حقائق کی تلاش (4) علت و معلول کا رشتہ (5) حتمی علم (6) معلومات جمع کرنا (7) مشاہدات و تجربات (8) مفروضے و تصدیقات (9) قوانین (10) نتائج

(1) حقائق معلوم کرنا:۔ کسی بھی مسئلہ، واقعہ یا شے کی حقیقت جاننے کی کوشش سائنسی اندازِ فکر میں کی جاسکتی ہے۔ حقائق تک پہنچنا ایک تحقیقی انداز ہے۔ حقائق معلوم کرنا اور پھر ان کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے سائنسی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ حقائق معلوم کرنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی شے کیا ہے؟ اس کے اجزا کون کون سے ہیں؟

(2) اشیا کا مشاہدہ کرنا:۔ سائنسی اندازِ فکر میں اشیا کا مشاہدہ تحقیقی انداز سے کیا جاتا ہے۔ یہی مشاہدہ علم کی ترویج و ترقی کا باعث بنتا ہے۔ مثلاً اشیا کے مشاہدے سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں کیمیائی تبدیلیاں کیسے اور کیوں کر ہوتی ہیں؟ اشیا کی ماہیت اور فطرت کیا ہے؟ اس کا اندازہ بھی مشاہدہ کے عمل سے ممکن ہوسکتا ہے۔ جس طرح تجربہ کی سائنسی اہمیت ہے اسی طرح مشاہدہ کی بھی سائنسی حیثیت ہے۔

(3) نئے حقائق کی تلاش:۔ سائنسی اندازِ فکر میں جدید طریقہ کار اپنا کر نئے حقائق تلاش کئے جاتے ہیں۔ ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر تجربی صورتِ حال بدلنے پر نئے حقائق سامنے آتے ہیں اور یہ صرف اور صرف سائنسی فکر ہی سے ممکن ہوتا ہے نئے حقائق سے مراد وہ بنیادیں یا اصل تصورات ہیں جن کا پہلے انکشاف نہیں ہوا ہوتا لیکن وہ موجود ضرور ہوتے ہیں۔ سائنسی تحقیق سے ہم ان کی بنیادوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرح جیسے جیسے علوم میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان کا شعور ترقی کرتا ہے تو کائنات سے متعلق نئے حقائق سامنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب فکری انداز کی بنیاد سائنسی طریق کار ہو۔

(4) علت و معلول کا رشتہ:۔ سائنسی اندازِ فکر سے کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ دریافت کی جاتی ہے۔ علم طبیعیات ہمیں بتاتا ہے کہ ہر شے یا واقعہ کی کوئی نہ کوئی وجہ یعنی علت ضرور ہوتی ہے۔ اس کے ہونے اور وجہ کے آپس میں رشتے کو دریافت کرنا سائنس کا کام ہے۔ علت و معلول کے رشتے دریافت کر کے ہم حقائق تک پہنچتے ہیں۔ سائنس میں علت کسی شے کی وجہ کو کہتے ہیں جبکہ اس شے

کو معلول کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی واقعہ کے ہونے کی وجہ کو علت اور اس واقعہ کے ہونے کو معلول کہا جاتا ہے۔ علت ومعلول کا رشتہ سائنسی طریق کار سے ہی جانا جاسکتا ہے۔ اس عمل سے تخلیقی اور تحقیقی ترقی ممکن ہوتی ہے۔

طبیعات، کیمیا، حیاتیات، اور دوسرے تمام تر تحقیقی علوم میں علت ومعلول کا تعلق تلاش کرنا ایک اہم اور خصوصی عمل ہوتا ہے۔

(5) **حتمی علم:۔** تحقیق وتجزیہ سے پتا چلتا ہے کہ ہر دور میں فکری ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے فلسفیانہ انداز میں کہا جاتا ہے کہ علم کبھی حتمی نہیں ہوتا۔ سائنسی علوم میں بھی ہمہ وقت ترویج وترقی، تحقیق اور تخلیق کی بنا پر جدید نظریات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہر نیا دور نئی دریافتیں لے کر آتا ہے۔ نئے سائنسدان جدید علوم متعارف کراتے ہیں۔ گذشتہ دور کا علم بنیاد ضرور بنتا ہے لیکن علم کی جہتیں نئے انداز سے سامنے آنے پر رد ہوجاتا ہے۔ اس طرح سائنسی علوم کے حقائق بھی کچھ عرصہ بعد غیر حتمی ہوجاتے ہیں۔ اس کے باوجود سائنس کا علم فلسفہ کی نسبت حتمی ہوتا ہے۔

(6) **معلومات جمع کرنا:۔** سائنسی اندازِ فکر میں معلومات جمع کر کے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے تحقیق وتخلیق کا انداز صحیح بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ سائنس میں معلومات (Data) جمع کرنا ہی اہم کام ہے۔ کیا؟ کب؟ کیسے؟ کے سوالات کا جواب معلومات ہی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔

تاریخی، تدریجی یا ارتقائی صورت حال میں سائنسی فکر میں معلومات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ کسی بھی مادہ یا قوت کا تاریخی جائزہ لینا ہو تو اس کی ابتدا جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کس کس دور میں اس موضوع یا علم سے متعلق کیا کیا تحقیقی کام ہوا ہے۔ ان معلومات کی وجہ ہی سے نئے حقائق کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔

(7) **مشاہدات وتجربات:۔** معلومات عموماً مشاہدات اور تجربات کی وجہ سے جمع کی جاتی ہیں۔ کسی واقعہ کا مشاہدہ کر کے اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شے دیکھیں گے ہی نہیں تو اس کے بارے میں جانیں گے کیسے؟ اس لئے اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ ضرورت کے تحت تجربہ گاہوں میں تجربہ کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں سائنسی فکر پروان چڑھتا ہے۔

(8) **مفروضے، تصدیقات:۔** سائنسی علوم میں مفروضے قائم کئے جاتے ہیں اور پھر مشاہدات، تجربات اور معلومات سے ان کی تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ واقعہ، شے یا نظریہ وہی ہے جو ہمارے زیرِ مطالعہ ہے، دھات کے ایک ٹکڑے کا لیبارٹری میں تجزیہ کر کے پتہ چلتا ہے کہ اس میں عناصر ترکیبی کتنی مقدار میں شامل ہیں۔ اس طرح تجربی طریقہ کار سے اس کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ مفروضے قائم کرنا فلسفیانہ انداز ہے۔ تصدیق کرنا منطقی طریق ہے۔ لیکن یہ دونوں اعمال سائنس کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہیں۔ جب تک تصدیق نہ ہو سائنسی علوم آگے نہیں بڑھتے۔

(9) **قوانین:۔** ہر علم کے اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ سائنسی فکر بھی اپنی اصطلاحات اور قوانین رکھتی ہے۔ ان قوانین ہی کو مدنظر

رکھ کر فکر کی ارتقائی منازل طے کی جاتی ہیں۔بعض اوقات قدرتی قوانین سائنسی فکر میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور بعض اوقات ہر علم کی متعلقہ شاخ کے اصول وقوانین کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ سائنسی فکر میں قوانین کی اہمیت مصدقہ ہے۔

(10) نتائج:۔ سائنسی علوم کا منتہائے مقصود ان کے نتائج یا حاصلات ہوتے ہیں۔ مشاہدات، تجربات، تصدیقات، قوانین، علتی رشتے، حقائق کی تلاش غرضیکہ سائنسی فکر کا کوئی بھی پہلو ہو اس میں سے نتائج اخذ کرنا ہی اہم کام ہوتا ہے۔نتائج سائنسی فکر کی ابتدا بھی ہوتے ہیں اور انتہا بھی۔ابتدا اس لئے کہ مزید ارتقائی مراحل کے لئے حاصل کردہ نتائج مدد دیتے ہیں اور انتہا اس لئے کہ نتائج دراصل سائنسی فکر کے ثمرات ہوتے ہیں۔

سائنس اور فلسفہ میں فرق

Difference Between Science & Philosophy

سائنس کے معنی اشیا اور نظریات کے حقائق جاننے کے ہیں۔ جدید فلسفی ڈبلیو۔ ٹی۔ سٹیس (W.T.Stace) کا نقطہ نظر ہے کہ سائنسی علوم کی جہاں انتہا ہوتی ہے وہاں سے آگے فلسفیانہ تحقیقات کی ابتدا ہوتی ہے۔ پہلے کوئی نظریہ، سوچ یا فکر پیدا ہوتی ہے۔ ۔پھر اس نظریہ پر سائنسی تحقیق ہوتی ہے۔ سائنسدان تجربہ گاہ میں کام کرتا ہے۔ تجربہ گاہ ایک کمرہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ پوری کائنات بھی ایک تجربہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔فلسفیانہ سوچ کو سائنسی علوم عملی شکل میں ڈھالتے ہیں۔

فلسفہ اور سائنس کا آپس میں گہرا تعلق ہے لیکن طریق کار اور اندازِ تحقیق کے لحاظ سے دونوں میں فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اس فرق کی بنیاد پر دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں۔لیکن اس کے باوجود فلسفہ اور سائنس دونوں کی ابتدا سوچ پر مبنی ہے اور مقاصد یا منزل پر پہنچنے کے لیے نتائج اخذ کر کے حقائق کا پتہ لگایا جاتا ہے۔درج ذیل نکات سائنس اور فلسفہ میں پائے جانے والے فرق کو واضح کریں گے۔یہ فرق یقیناً طریق کار اور انداز فکر کا ہے۔

(1) جزوی اور کلی علم (2) نظری اور عملی پہلو (3) سائنس فلسفہ کی محتاج (4) حقائق اور قدر و قیمت (5) مادی اور ذہنی انقلاب (6) حتمی اور غیر حتمی نتائج (7) مستند تحقیق اور مفروضے (8) علت ومعلول اور واقعاتی صورت (9) جذبات اور احساسات (10) منظم معلومات اور تعبیر (11) مسلسل عمل (12) پیش گوئی (13) مشاہدہ اور تخیل

(1) جزوی اور کلی علم:۔ ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) کے خیال میں سائنس جزوی طور پر منظم علم ہے۔ جبکہ فلسفہ مکمل طور پر منظم علم ہے۔ سائنس کسی بھی موضوع کو ہر زاویے سے جانچنے کی تگ ودو کر کے نتائج اخذ کرتی ہے۔ معمولی سے معمولی چیز کا بھی باریک بینی سے جائزہ لیتی ہے۔ سائنسی علوم ان چھوٹی چھوٹی جزیات کو منظم کر کے سائنسی تحقیق کرتے ہیں۔ جبکہ فلسفہ کائنات کو کلی طور پر لیتا ہے۔ منظم، مرتب اور آفاقی نظریات قائم کرتا ہے۔سائنس اور فلسفے میں بنیادی اور اہم یہی ہے جس کی بنا پر دونوں کی راہیں ابتدا ہی سے الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ سائنسی حقیقت کسی خاص واقعہ یا مشاہدے سے متعلق ہوتی ہے۔ جبکہ فلسفہ کلی تصور سے

متعلق۔

(2) **نظری اور عملی پہلو:۔** فلسفہ نظریات قائم کرتا ہے اور سائنس نظریات پر تجربات کرتی ہے۔ اس طرح فلسفہ بنیادی طور پر نظری ہے جبکہ سائنس اس کا عملی پہلو ہے۔ فلسفے میں صرف اور صرف نظریات تشکیل دیے جاتے ہیں یا یہ نظریات رڈ کر کے مزید نظریات متعارف کرائے جاتے ہیں۔ سائنس میں مشاہدات اور تجربات پر انحصار کیا جاتا ہے۔

(3) **سائنس فلسفہ کی محتاج ہے:۔** سائنس اور فلسفہ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ منطقی قوانین سائنسی فکر کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا مناسب ہے کہ سائنس فلسفہ کی محتاج ہے۔ یہ اہم فرق اس لئے ہے کہ جب تک سائنس کو فکری اصول و ضوابط مہیا نہ کئے جائیں اس وقت تک کوئی تجربہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ کوئی فلسفی یا فلسفیانہ سوچ رکھنے والا سائنس دان افکار و نظریات قائم کرنے کے بعد سائنسی مطالعہ یا تجربہ کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ابتدا میں ہر سائنسی فکر فلسفے ہی کا حصہ تھی۔ تحقیق جب اپنی انتہا کو چھونے لگی تو سائنس فلسفے سے الگ ہوگئی۔ لیکن اس کی بنیادیں اور حقائق جاننے کے لئے اصول وضوابط فلسفہ ہی مہیا کرتا ہے۔ اور سائنس ان اصولوں کو بنیاد بنا کر اپنی تخلیقی و تحقیقی کاوش آگے بڑھاتی ہے۔

(4) **حقائق اور قدر و قیمت:۔** سائنس میں حتمی طور پر حقائق جانے جاتے ہیں جبکہ فلسفہ میں حقائق جاننے کی کوشش کے ساتھ قدر و قیمت اور اہمیت کو جانا جاتا ہے۔ اسی لئے سائنس میں کیا اور کیسے کے جوابات تلاش کئے جاتے ہیں جبکہ قدر و قیمت جاننے کے لئے فلسفہ کیوں کی وضاحت کرتا ہے۔ کوئی شے کیسے ہے اور حقیقت کیا ہے؟ سائنس بتاتی ہے اور اس کی اہمیت کے لحاظ سے یہ کیوں ہے کا جواب فلسفہ دیتا ہے۔ سائنس اور فلسفے میں یہی فرق اس کی مادی اور تصوری حیثیت کو الگ الگ کرتا ہے۔

(5) **مادی اور ذہنی انقلاب:۔** سائنس اور فلسفہ میں ایک اور اہم فرق یہ ہے کہ سائنسی فکر کی مدد سے تجربات کی بنیاد پر دنیا میں مادی انقلاب برپا ہوتا ہے۔ لوگوں کو مادی سہولتیں ملتی ہیں۔ بجلی کا بلب اندھیرے میں روشنی مہیا کرتا ہے۔ پنکھا ہوا اور فریج، اشیا کی حیاتیاتی ساخت کو برقرار رکھتے ہیں۔ کار، ریل کار، جہاز، کمپیوٹر غرضیکہ لاتعداد ایسی ایجادات موجود ہیں جو سائنسی فکر کی بنیاد پر بنائی جاتی ہیں اور عوام الناس کے لئے آسانیاں پیدا کرتی ہیں۔ فلسفہ افکار و نظریات مہیا کرتا ہے۔ معاشی، معاشرتی، اخلاقی، صنعتی اور دیگر کئی ایک نظریات فلسفہ ہی نے مہیا کئے ہیں ان نظریات سے نوجوان نسل کے ذہنوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں جتنے بھی انقلابات آئے ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی فلسفہ پنہاں تھا۔ اسلام دنیا میں اخلاقی اور معاشرتی انقلاب لے کر آیا۔ سوشلزم کا معاشی اور فرانس کا سیاسی انقلاب فلسفیانہ افکار ہی کی بنیاد پر ہوا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سائنس مادی انقلاب لاتی ہے جبکہ فلسفہ ذہنی انقلاب برپا کرتا ہے اور دنیا کے حالات بدل دیتا ہے۔ سائنس سہولتیں مہیا کرتی ہے۔

(6) **حتمی اور غیر حتمی نتائج:۔** سائنس میں نسبتاً حتمی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں لیکن فلسفے میں کبھی بھی کچھ حتمی نہیں ہوتا۔ فلسفیانہ

افکار میں ہر لحہ تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے جونہی کوئی فلسفی کسی بھی نوعیت کا نظریہ قائم کرتا ہے کوئی اورعالی دماغ اس کے مقابل نیا نظریہ پیش کر دیتا ہے۔ اس طرح فلسفہ رد کر دیا جاتا ہے جبکہ رد فلسفہ بھی ایک فلسفہ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے فلسفیانہ افکار تسلسل اور ترتیب کے ساتھ اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے جاتے ہیں۔ جبکہ سائنسی فکر سے نئی اشیا بنائی جاتی ہیں۔ فارمولے دریافت کئے جاتے ہیں۔ سائنسی فکر سے حتمی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں جبکہ فلسفہ میں کچھ بھی حتمی نہیں ہوتا۔ مثلاً آکسیجن مکسچر کو خاص عمل سے گزار کر آکسیجن بنائی جاسکتی ہے۔ اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ حتمی طور پر یہ طے ہے کہ آکسیجن مکسچر سے آکسیجن گیس بنائی جاسکتی ہے۔

(7) **مستند تحقیق اور مفروضے:۔** یہ بات صحیح ہے کہ سائنس کی بنیادیں مفروضوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن مفروضوں کے بعد مستند تحقیق کی جاتی ہے۔ مستند تحقیق سے غلط اور غیر ضروری مفروضے ختم کر دیے جاتے ہیں۔ صحیح اور مناسب مفروضوں کی بنیاد پر مزید تحقیق کی جاتی ہے۔

(8) **علت ومعلول اور واقعاتی صورت:۔** فلسفی ڈبلیو۔ ٹی سٹیس کے خیال میں ہر واقعہ کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوتی ہے، اگر "الف" کی وجہ سے "ب" ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ "الف" علت ہے اور "ب" معلول ہے۔ سائنسی فکر میں علت ومعلول کا رشتہ ضرور تلاش کیا جاتا ہے۔ جبکہ فلسفہ میں علت ومعلول سے آگے واقعاتی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یعنی جو واقعہ جن حالات، ماحول یا تقاضوں کے مطابق رونما ہوتا ہے۔ ان کے مطابق ہی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں، سائنس اور فلسفہ میں یہی فرق ہے کہ سائنس میں علت ومعلول دریافت کئے جاتے ہیں۔ جبکہ فلسفہ میں واقعاتی صورت حال کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔

(9) **جذبات اور احساسات:۔** سائنس اور فلسفہ میں ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ بعض سائنسی علوم میں جذبات اور احساسات کا خیال رکھا جاتا ہے ان کی بنیاد پر نتائج مرتب کئے جاتے ہیں جبکہ فلسفے میں عمرانی علوم کی طرح انسانی جذبات اور احساسات کا کوئی عمل دخل نہیں، انسانی ذہن اور کردار کو جاننے کے لئے نفسیات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ نفسیات ایک سائنس ہے۔ نفسیات میں بچوں اور بڑوں کے جذبات واحساسات کو سمجھا جاتا ہے کیونکہ انفرادی اختلافات کی بنیاد پر ہی شخصیت کا دارومدار ہے۔

(10) **منظّم معلومات اور تعبیر:۔** سائنس میں منظّم معلومات پر مبنی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ یہی نتائج تعبیر ہوتی ہے۔ فلسفہ میں بھی منظّم اور مرتب معلومات ہوتی ہیں لیکن وہ اپنی خود حیثیت رکھتی ہیں جبکہ سائنسی فکر میں معلومات منظّم کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی جزئیات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ فلسفہ بنیادی طور پر کلی حقائق سے بحث کرتا ہے۔

(11) **مسلسل عمل:۔** سائنسی فکر ایک مسلسل عمل ہے۔ جس سے فکر اپنی ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ فلسفہ میں بعض اوقات مسلسل عمل کے ساتھ ایک دم سب نظریات رد کر کے ایک نئی ابتدا کی جاتی ہے۔ سائنس میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ تمام گذشتہ علوم سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

(12) **پیش گوئی:۔** سائنس کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی بھی نوعیت کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ موسمی حالات دیکھ کر محکمہ موسمیات والے بتادیتے ہیں کہ اتنے گھنٹے بعد بارش ہوگی۔ موسم خوشگوار رہے گا یا نہیں ۔ بارش اور خشک موسم کی پیش گوئی کی جاتی ہے۔ نباتات، حیاتیات اور دیگر تمام علوم میں اس کی ضرورت اور اہمیت کے مطابق پیش گوئی کی جاتی ہے ۔ جبکہ فلسفہ میں ایسی صورت حال نہیں ہوتی۔

(13) **مشاہدہ اور تخیل:۔** سائنسی فکر کی زیادہ تر بنیاد مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہوتی ہے۔ جبکہ فلسفہ تخیلات سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ تخیل کی پرواز مختلف قسم کے انکشافات کرتی ہے۔

فلسفہ تخیلاتی ،تصوری اور خیالی دنیا میں لے جاتا ہے۔ لیکن سائنس کی بنیادیں واضح طور پر مشاہدے اور تجربے پر استوار ہوتی ہیں۔

سائنس کا مشاہداتی علم اور فلسفے کی تخیلاتی سوچ کی بنا پر دونوں کی الگ الگ حیثیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

سائنس کی ترویج و ترقی میں فلسفے کا کردار

The Role of Philosophy in the Development of Science

سائنسی علوم کو حقائق کی دریافت کے لئے فکری بنیادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فکری بنیادیں فلسفہ مہیا کرتا ہے ۔ سائنس کے ہر شعبہ میں فلسفیانہ انداز اپنا کر ہی کسی مسئلہ کی تہہ تک پہنچا جاتا ہے۔ سائنسی موضوعات کا تجزیہ کر کے بنیادی جواہر کا علم حاصل کیا جاتا ہے ۔ تجزیہ کا عمل فلسفہ کی دین ہے۔ فلسفہ اور سائنس حقیقتاً فکر انسانی کی عظیم شاہکار مثالیں ہیں۔ تحقیقات اور تصورات کی ترکیب فلسفیانہ افکار سے حاصل کر کے سائنسی علوم کی ترویج و ترقی ہوتی ہے۔

سائنسی علوم میں ٹھوس اور مدلل طریقہ کار اپنا کر نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اور یہ منطقی طریقہ کار فلسفہ ہی مہیا کرتا ہے۔ فلسفہ سائنس کو تجربہ گاہ سے نکال کر سوچ و بچار اور فکر وتدبر کی دنیا میں لے جاتا ہے جس سے نئی دریافتیں اور انکشافات ہوتے ہیں۔ فلسفہ سائنس کو نظری بنیادیں مہیا کرتا ہے اور سائنس اس کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ سائنس کی ترویج و ترقی میں فلسفے کا کیا کردار ہے اس کا درج ذیل موضوعات کے تحت جائزہ لیا جاتا ہے۔

1۔ تعبیرات (Interpretations)   2۔ تنقید (Criticism)

3۔ مناقشات کا حل (Conflicts Resolutions)   4۔ جواز (Justifications)

1۔ تعبیرات Interpretations:۔

سائنسی افکار کے کسی بھی موضوع اور مسئلہ کی وضاحت آسان زبان میں کی جاتی ہے تاکہ اس کے معنی اور حقیقت عیاں ہوجائیں ۔ اس عمل کو اس مشکل مسئلہ کی تعبیر کہا جاتا ہے۔ لغوی معنی کی وضاحت اور اصلی مفہوم جاننا نہایت ضروری ہے۔ یہ کام فلسفیانہ افکار سے ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ تجزیہ کا فن فلسفہ مہیا کرتا ہے۔ علوم کا تجزیہ کر کے صحیح نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ صحیح نتائج حاصل

کرنے کے لئے فلسفے کی ایک شاخ منطق سے مدد لی جاتی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس عمل کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ گویا وہ نتیجہ اس عمل کے اندر ہی چھپا ہوتا ہے۔ لیکن استقرائی یا استخراجی طریقہ کار اسے واضح کر دیتا ہے۔

سائنسی فکر کی تعبیر میں تجزیہ کا خصوصی عمل دخل ہوتا ہے۔ نفسیات (Psychology) ذہن اور کردار کی سائنس ہے۔ اس میں انسان کے ذہن اور کردار سے متعلق اعمال وافعال کا تجزیہ کر کے تعبیر کی جاتی ہے۔ یعنی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں مثلاً خوابوں کی تعبیر کر کے انسانی شخصیت کے متعلق ماضی اور مستقبل کے واقعات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ طبیعیات (Physics) میں مادے اور توانائی سے متعلق اعمال وافعال اور تبدیلیوں کے حوالے سے تجزیہ کر کے تعبیر یعنی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ کیمیا (Chemistry) میں مادے کی ساخت کے حوالے سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

ان چند ایک مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ سائنسی فکر کی ترویج وترقی کے سلسلے میں نتائج اخذ کرنے یعنی مسائل اور واقعات کی تعبیر کرنے میں فلسفہ کے تجزیاتی طریق کار سے مدد لی جاتی ہے۔

2۔ تنقید (Criticism):۔

سائنسی علوم کو نتائج حاصل کرنے کے لئے جس پراسیس سے گزارا جاتا ہے اس کا انحصار فکری بنیادوں پر ہوتا ہے۔ تعبیر یا نتائج کے حصول کے بعد تصدیقات کے ذریعہ جانچ پڑتال کی جاتی ہے کہ یہ نتائج صحیح اخذ ہوئے ہیں یا نہیں۔ کیا وہی نتائج حاصل ہوئے ہیں جن کی ہمیں توقع یا ضرورت تھی یا نہیں۔ اس لئے اُن کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔ پیمائش (Measurment)، تخمین (Assesment) اور خصوصی طور پر جائزہ (Evaluation) کے ذریعے تنقیدی مراحل طے کئے جاتے ہیں۔ تنقید میں ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھا جاتا ہے جو کسی شے کے بننے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تمام عوامل (Factors) اور قدرتی قوانین (Natural laws) کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ حاصلات کی بنیاد بننے والے اصول وضوابط کون کون سے ہیں؟ تنقید کا طریق کار ایک تو اصول وضوابط کے مطابق ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں سے تنقیدی موازنہ کیا جاتا ہے۔

سائنس میں کسی بھی مادی شے کو تجربہ گاہ میں تجزیہ کر کے جانا جا سکتا ہے کہ اس میں کون کون سی اشیا کے کتنے جواہر (Elements) شامل ہیں۔ کیمیائی تجزیہ بھی عملی تنقید کا نمونہ ہوتا ہے۔ سائنس میں تحقیق کے ذریعے علمی اور فکری ترقی کے مراحل طے کئے جاتے ہیں۔ سائنسی ترقی سے مراد یہ ہے کہ تحقیق میں کس درجہ کا میابی حاصل ہوئی ہے۔ تحقیق کے لئے تصدیقات (Verifications) کرنا لازمی امر ہے۔ اسی طرح تصدیقات تنقید اور تجزیہ کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تنقید کا عمل سائنسی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تنقید سے بنیادیں، اعمال اور حاصلات سب کی جانچ پڑتال کی جاسکتی ہے۔

3۔ مناقشات کا حل (Conflicts Resolution):۔

سائنسی علوم دریافتوں اور ایجادات کی منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں عملی صورت کہیں رک جاتی ہے۔ تو پھر سوچ کے دریچے وا ہوتے ہیں اور فلسفہ سائنسی علوم کو تحقیق وجستجو کی کئی ایک نئی راہیں سُجھا دیتا ہے۔ اس صورت میں افکار میں اختلافات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان اختلافات یا مناقشات سے بھی علوم میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ سائنس میں چونکہ تجربی پہلو زیادہ ہوتا ہے۔ اس

لئے ان مناقشات یا اختلافات کا حل تلاش کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور یہ حل صرف اور صرف غور وفکر ہی مہیا کرسکتا ہے۔ جہاں فلسفہ تنقید وتنقیص کے اتار چڑھاؤ میں سے گزرتا ہے۔ وہاں تمام تر فکری رکاوٹوں کو عبور کرنا بھی فلسفہ ہی سے ممکن ہوسکتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات ایک سائنسی نظریہ پر کام ہو رہا ہوتا ہے کہ ساتھ ہی دوسرا نظریہ کسی کے ذہن میں پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن ایسا بھی دور آتا ہے کہ سالہا سال کوئی نیا سائنسی نظریہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ گویا سائنسی ماحول جمود کا شکار ہوجاتا ہے۔ پھر کوئی ذی فہم فلسفی رکاوٹوں کی جمی ہوئی برف کو پگھلاتا ہے۔ اس طرح رکاوٹیں عبور کرکے نئی سوچ وبچار اور تفکر کی مدد سے کوئی نہ کوئی نیا سائنسی نظریہ ایجاد ہوجاتا ہے۔ اس طرح سائنس کے لیے راستہ ہموار ہوتا ہے۔

4۔ جواز (Justification):۔

سائنس ہمیشہ تحقیق وجستجو کی بنا پر نئے علوم وقوانین دریافت کرتی رہتی ہے۔ جیسے قدرتی قوانین ابتدا ہی سے موجود ہیں لیکن عقل ودانش رکھنے والے سائنس دانوں نے ان کو متعارف کرایا۔ جب کبھی بھی سائنسی اصول وضع کئے جاتے ہیں تو ان کی تصدیق اور جواز تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ جواز (Justification) منطق کے قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔

ہرشے کے بارے میں ایک تصور پایا جاتا ہے۔ جیسے انسان کا تصور کتاب کا تصور وغیرہ۔ جب تصور کو الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے تو منطقی اصطلاح میں اسے حد (Term) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دو تصورات کے درمیان تعلق پیدا ہوتا ہے تو یہ تعلق ان دونوں تصورات کے تقابل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس تقابل کو عملِ تصدیق کہتے ہیں۔ منطق کا تعلق عمل تصدیق کے نتیجہ سے ہے۔ عمل تصدیق کے نتیجہ کو نتیجہ تصدیق یا صرف تصدیق کہتے ہیں۔ آکسیجن گیس ہے۔ پانی مائع ہے۔ اس میں آکسیجن ایک تصور ہے اور گیس بھی ایک تصور ہے۔ دونوں میں تعلق پیدا کرکے بتایا جاتا ہے کہ آکسیجن ایک گیس ہے۔ اسی طرح پانی ایک تصور ہے اور مائع ایک دوسرا تصور ہے۔ پانی اور مائع دونوں میں تعلق پیدا کرکے پانی ایک مائع ہے۔ یہ دونوں تصدیق کی مثالیں ہیں۔ جس سے سائنس کا کام آسان ہوجاتا ہے اور جواز یا تصدیق ہوجاتی ہے۔

اس ساری بات کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ فلسفہ کی شاخ منطق، سائنسی علوم کے تصورات کا تعلق پیدا کرکے تصدیقات مہیا کرتی ہے۔ اس طرح جب تک فلسفہ سائنس کی دریافتوں، قضیوں، قوانین اور اصولوں کی تصدیق یا جواز مہیا نہ کرے یہ سائنسی علوم کا حصہ نہیں بن سکتے۔

مشقی سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1:۔ سائنس کی جامع تعریف بیان کریں۔

2:۔ سائنسی اندازِ فکر سے کیا مراد ہے۔

3:۔ سائنس اور فلسفہ میں فرق بیان کریں۔

4:۔ سائنس کی ترویج و ترقی میں فلسفے کا کیا کردار ہے۔؟

5:۔ فلسفہ سائنس کو جواز مہیا کرتا ہے واضح کریں۔

معروضی طرز (Objective Type)

6:۔ سائنسی فکر جہاں ختم ہوتی ہے، فلسفہ کی وہاں سے ابتدا ہوتی ہے۔اس بیان کی وضاحت کریں۔

سوال 1:۔ درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

1:۔ سائنسی تحقیق میں اشیا کا.................کیا جاتا ہے۔

2:۔ سائنسی اندازِ فکر میں علت و.................کا رشتہ دریافت کیا جاتا ہے۔

3:۔ سائنس کائنات کا بحیثیت.................مطالعہ کرتی ہے۔

4:۔ سائنسی علوم جہاں آ کر ختم ہوتے ہیں فلسفہ وہاں سے.................ہوتا ہے۔

5:۔ سائنسی علوم میں.................نتائج پائے جاتے ہیں۔

سوال 2:۔ ذیل میں سوالات کے ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں۔ صحیح کی نشاندہی کیجئے۔

1:۔ سائنس کے معنی ہیں۔

1۔علم 2۔تحقیق 3۔تخلیق 4۔ابہام

2:۔ علوم کی عمومی طور پر اقسام ہوتی ہیں۔

1۔ایک 2۔دو 3۔تین 4۔چار

3:۔ یہ کس کا قول ہے کہ ”سائنس کوئی نئی شے دریافت نہیں کرتی بلکہ وہ پہلے سے موجود ہوتی ہے۔“

1۔وڈ ورتھ 2۔ولیم جیمز 3۔ارسطو 4۔علامہ محمد اقبالؒ

4:۔ ”ہمارا بیشتر علم بے حد خیالی اور سطحی ہوتا ہے۔“ یہ کس کا کہنا ہے۔

1۔الکندی 2۔برگساں 3۔شیلے 4۔افلاطون

5:۔ کس یونانی فلسفی نے سب سے پہلے یہ نظریہ دیا تھا کہ مادہ کی تقسیم جہاں نہیں ہو سکتی اسے آیٹم کہتے ہیں۔

1۔ڈیمو کرائیٹس 2۔افلاطون 3۔ارسطو 4۔سقراط

6:۔ شہرہ آفاق تصنیف Princpia Mathemetica کے مصنف سائنسدان کا نام ہے۔

1۔آئین سٹائن 2۔کوپرنیکس 3۔ نیوٹن 4۔گلیلیو

7:۔ یہ کس نے کہا تھا:" سائنسی علوم کی جہاں انتہا ہوتی ہے، وہاں فلسفیانہ تحقیقات کی ابتدا ہوتی ہے۔"

1۔ ڈبلیو۔ ٹی سٹیس 2۔ولیم جیمز 3۔نیوٹن 4۔ افلاطون

8:۔یہ کس کا خیال ہے کہ"سائنس جزوی طور پر منظم علم ہے جبکہ فلسفہ مکمل طور پر منظم علم ہے۔

1۔سپنسر 2۔نیوٹن 3۔وڈورتھ 4۔ارسطو

9:۔ نظریہ اضافیت کس کا نظریہ ہے؟

1- میکس پلانک 2- آئن سٹائن 3-نیوٹن 4۔ کوپرنیکس

10:- ہر واقع کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔" یہ کس فلسفی نے کہا۔"

1- کوپرنیکس 2- برگساں 3- ڈبلیو۔ ٹی۔ سٹیس 4- ولیم جیمز

سوال3: کالم"الف"اور کالم"ب" میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم"ج" میں درج کریں۔

کالم"الف"	کالم"ب"	کالم"ج"
☆ سائنس کے معنی	جامع معلومات ہیں۔	
☆ علوم کی عمومی اقسام	ہمارا بیشتر علم خیالی و سطحی ہے۔	
☆ سائنس سے مراد	بتدریج تحقیق ہوتی ہے۔	
☆ ووڈورتھ کا خیال ہے	نظریہ ایٹم کی نشو ونما کی۔	
☆ برگساں کا خیال ہے	جاننا ہے۔	
☆ سائنس میں	دو ہیں۔	
☆ جان ڈالٹن نے	سائنس کوئی نئی شے نہیں بناتی۔	
☆ سائنس اور فلسفہ میں	اتفاقی نہیں ہوتے۔	
☆ معلومات کی بنیاد	فرق بھی پایا جاتا ہے۔	
☆ واقعات	مشاہدات وتجربات پر مبنی ہوتی ہے۔	

علم (Knowledge)

علم سے کیا مراد ہے؟ کیا ہم کسی شے کا صحیح علم حاصل کر سکتے ہیں؟ کسی شے کی حقیقت کیا ہے اور کیا حقیقت کا علم ممکن ہے؟ علم کے ماٰخذ کون کون سے ہیں؟ ایسے ہی کئی ایک سوالات ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ ابھرتے رہتے ہیں۔ ابتدائے زمانہ ہی سے مفکرین علم کی نوعیت اور ماہیت جاننے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ بعض مفکرین علم حاصل کرتے ہوئے کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن بعض فلسفی ہمیشہ اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ جاننے کی جستجو علم در علم کے پردے کھولتے چلی جاتی ہے۔ کیونکہ فکر کہیں رکتا نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فلسفہ میں کچھ بھی حتمی نہیں ہوتا۔ ہر نئے زمانے میں فکر کا ارتقا ہوتا رہتا ہے اور علم کے نئے نئے زاویے سامنے آتے رہتے ہیں۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ علم ہے کیا؟ علم ایک تجربہ ہے جو انسان کو ہر لمحہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ علم ایک ایسا تجربہ ہے جو حیرانی اور تعجب سے شروع ہوتا ہے۔ اور ہمیں ہر لمحہ اس تجربہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تجربہ جب شعور و آگہی کی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ تو انسان اپنا اور اپنے دائرہ شعور میں آنے والے مسائل کا علم حاصل کرتا چلا جاتا ہے اور تصورات قائم ہوتے ہیں۔ بعض تصورات کی تصدیق کی جاسکتی ہے، بعض کی تصدیق ممکن نہیں۔ یونانی فلسفی سقراط کا خیال ہے کہ علم صحیح اعتقاد (Belief) کی تصدیق ہے۔

فلسفے کی شاخ علمیات کا اہم فریضہ علم کی وضاحت کرنا ہے۔ انسان کچھ بھی محسوس کرتے ہوئے اسے معنی دیتا ہے تو اس عمل کو ادراک کہتے ہیں اور ادراک جس کو محسوس کر رہے ہوتے ہیں اس کا علم ہوتا ہے۔ جتنا ہمارا ادراک زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی ہمارا علم زیادہ ہوگا ہم اشیا مدرکہ کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ تو ہمارے احاطۂ شعور سے ہوتا ہوا یہ علم لاشعور کی انتہائی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم علم کیسے حاصل کرتے ہیں؟ ہمارے ذرائع علم کیا ہیں؟ وہ کون کون سے وسائل ہیں جن کے ذریعے انسان جاننے کا عمل کرتا ہے۔

جان ہاسپر (John Hosper) اپنی تنقیدی کتاب ''فلسفیانہ تجزیہ کا تعارف'' (An Introduction to Philosophical Analysis) میں لکھتا ہے کہ علم کو قضیوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً میں جانتا ہوں کہ ''اب ایک کتاب پڑھ رہا ہوں۔'' میں جانتا ہوں کہ دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔'' لیکن صحیح یا غلط قضیے کو جاننے کے لیے تصورات کا جاننا ضروری ہے۔ کیونکہ تصورات سے ہی جملے یا قضیے بنتے ہیں۔ مثلاً ''برف پگھلتی ہے'' اس میں برف اور پگھلنا دونوں کے معنی جاننے کے لیے ان کے تصورات کو جاننا ضروری ہے۔

بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ انسان کے ذہن میں پیدائشی طور پر وہبی خیالات (Innate Ideas) ہوتے ہیں۔ یعنی انسان پیدائشی طور پر خیالات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا ایسا ممکن ہے پیدائشی اندھا سرخ رنگ کا تصور لے کر پیدا

ہوتا ہے؟ کیا وہ سرخ رنگ کی شناخت کرسکتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔

جان ہاسپر ایک اور مثال سے علم کی وضاحت کرتا ہے۔ علم کیا ہے؟ جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں مسٹر اے کو جانتا ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ مسٹر اے (Mr.A) سے میری مکمل شناسائی ہے۔ میں اس کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے۔ میرا پڑوسی ہے وغیرہ وغیرہ۔

کوئی بھی قضیہ صحیح یا غلط اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اس کی کسی نہ کسی طرح سے تصدیق نہ ہو جائے۔ بعض اوقات یقین کرنے سے بھی ہم کسی شے جملے یا قضیے کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں کیونکہ ہمارے علم کی وسعت اور حدود میں گہرائی نہیں ہوتی۔ ایک زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ زمین چپٹی ہے تو لوگ اس بات کو مانتے تھے حالانکہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے۔ لیکن علم کی حد سے ہم اس پر یقین کر لیتے ہیں۔

علم سے مراد حواس کے ذریعہ حاصل کردہ ادراک ہے۔ ادراک حاصل ہونے کے بعد۔ اس وقت تک صحیح لگتا ہے جب تک وہ غلط ثابت ہو کر نئی شکل نہ اختیار کر لے۔ گویا علم جاننے کا نام ہے۔

ماخذِ علم

Sources of Knowledge

علم کہاں سے حاصل ہوتا ہے؟ یعنی وہ کون سے وسیلے ہیں جن سے علم اخذ کیا جاتا ہے؟ انسان مختلف انداز اور طریق سے علم حاصل کرتا ہے۔ صحیح الذہن شخص سب سے پہلے اپنے حواس کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے۔ اس طرح متعدد مآخذ علم میں سے چند ایک یہ ہیں:

1- حسی ادراک یا حسی تجربہ (Sense Experience or Sense Perception)

2- عقل (Reason)

3- استناد (Authority)

4- وجدان (Intuition)

5- وحی والہام (Revelation)

یہ مآخذ علم بنیادی طور پر علم کے مکاتب فکر کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ مختلف فلسفیوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جاننے کے عمل کو بیان کیا ہے۔

1- حِسّی تجربہ Sense Experience

حِس ایک سادہ تجربہ ہے۔ یہ ہمارا روزانہ کا معمول ہے۔ ذہن میں جب کوئی حِس بیدار ہوتی ہے تو اس کا کسی شے سے تعلق تلاش کیا جاتا ہے اور تجربات کی روشنی میں معنی کو گھٹایا بڑھایا جاتا ہے۔ حِسّی تجربہ میں توجہ، دلچسپی اور توقع سے مدد لی جاتی ہے۔ حِس کے ذریعے ہمیں خارجی اشیا کا علم حاصل ہوتا ہے اور جب ہمیں خود اپنی ذہنی حالت کا علم ہوتا ہے تو یہ داخلی ادراک کہلاتا ہے۔ اپنی خوشی، غمی، پریشانی

اور اطمینان کے بارے میں ہم خود ہی جانتے ہیں۔ یہی داخلی حسی ادراک ہوتا ہے۔

حِسّی تجربہ سے کسی شے کا صرف وقوف ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ ہم اس شے کو پہچان بھی لیتے ہیں۔ جاننے اور پہچاننے کے اس عمل کو ادراک کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یاد اور فکر سے بھی ادراک حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ہم اشیا کو دیکھتے، آوازوں کو سنتے، ذائقے اور دباؤ کو محسوس کرتے اور بو یا خوشبو کو سونگھتے ہیں تو اسی طرح محسوسات کے ذریعے اشیا، آواز، ذائقہ، دباؤ اور بُو کا علم حاصل کرتے ہیں۔ بچہ کسی گول شے کو پہلی دفعہ دیکھ کر ایک چمکتی ہوئی شے ہی محسوس کرے گا۔ پھر اسے بتایا جائے گا کہ یہ چمکتی ہوئی شے روپے کا سِکہ ہے تو بچہ اس گول چمکتی ہوئی شے کو روپے کا ہی نام دے گا۔ اس سے اگلے مرحلے میں وہ اس چمکتی ہوئی گول شے یا روپے کو دیگر اشیا میں سے پہچان لے گا۔ اس سارے عمل کو حِسّی ادارک یا حِسّی تجربہ کہتے ہیں۔ حواسِ خمسہ سے حاصل کردہ علم کو بھی حِسّی ادراک یا حِسّی تجربہ کہا جاتا ہے۔ اس میں نقائص بھی پائے جاتے یں لیکن تجربہ سے ہم ان کو دور کر سکتے ہیں۔

وڈورتھ کے خیال میں ادراک کا کام ارض سے شکل تعمیر کرنا ہے۔ مثلاً مختلف اشیا میں سے بچے کا سکے کو پہچاننا، مختلف آوازوں میں سے اپنی ماں کی آواز پہچاننا اور پھر ماں کی آوازوں میں بھی غصہ اور پیار کی آواز میں تمیز کرنا وغیرہ۔

حِسّی تجربہ حِسّی تحسسات و مہیجات سے حاصل ہونے والا ایسا ذہنی عمل ہے جس سے ہم خارجی اور داخلی دنیا کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اشیا کو معنی پہناتے ہیں اور ارض سے شکل کو الگ کرتے ہیں۔

حِسّی تجربہ ایک ٹھوس (Concrete) اور مرکب (Complex) ذہنی عمل ہے جو کسی عضوِ حس کی تحریک اور اس کی تعبیر سے ظہور میں آتا ہے اور ہمیں خارجی دنیا سے واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ اس میں حواس اور ان سے متعلقہ تصورات اور خیالات بھی شامل ہوتے ہیں۔

حِسّی تجربہ یا حسی ادراک سے ہم گرد و پیش کی دنیا کا تجربہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ پیدائش کے وقت بچے کے لئے کائنات ایک بے تفریق اور بے معنی تودہ سا لگتی ہے۔ وہ دنیا کی اشیا کے معنی نہیں سمجھتا۔ وہ ایک شے کو دوسری شے سے ممیز نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اشیا کا ادراک نہیں رکھتا کیونکہ ادراک سے مراد اشیا کے معانی کو جاننا ہے۔ بچے کے لئے سانپ اور گڑیا میں کوئی فرق نہیں مگر آہستہ آہستہ وہ اشیاء کے معانی جاننے لگتا ہے۔ لہٰذا ادراک سے مراد اشیا کے معانی کو جاننا، اشیا میں امتیاز پیدا کرنے یا اشیا کا تجزیہ کرنے سے ہے۔ ٹچنر (Tichner) کے خیال میں حِسی تجربہ جتنا ترقی کرے گا اتنا ہی دنیا کو ہم بہتر طور پر سمجھیں گے۔ علم ادراک ہی سے حاصل ہوتا ہے اور حسی تجربہ کے بغیر ہم بے علم رہتے ہیں۔ حِسّی تجربہ سے مراد مختلف اشیاء سے واقفیت ہے اور اشیا زمان و مکان میں پائی جاتی ہیں۔ اشیا سے حواس حاصل ہوتے ہیں اور ادراک حواس پر مشتمل ہوتا ہے۔ حِسّی تجربہ سب سے اہم اور پہلا ماخذِ علم ہے۔

2- عقل (Reason)

عقلی بنیادوں پر حسی ادراک کے بعد عقل اہم ماخذِ علم ہے۔ عقل میں فکر و تدبر سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ ارسطو کی منطق اور جدید منطق میں استدلال، استنتاج اور قیاس کے اصول و ضوابط پر علمی موشگافیاں کی جاتی ہیں۔

عقل سے ذہنی مشق ہوتی ہے اور حافظے کی تربیت کی جا سکتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی نئے ماحول اور حالات و واقعات میں اپنے

آپ کو پاتا ہے تو عقل ہی اسے ان مشکل حالات سے باہر نکالتے ہیں۔ استاد کو کوئی فکری نقطہ سلجھانا ہو، وکیل کو دلائل کی مدد سے اپنی بات کو موثر اور قابلِ فہم بنانا ہو یا جج کو حاصل کردہ دلائل، واقعات، بیانات اور شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کرنا ہو تو پھر استدلال ہی سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

عقل کے استعمال سے تنقیدی سوچ پروان چڑھتی ہے۔ تنقیدی سوچ تحقیق و تفتیش میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان تمام مراحل کا دارومدار استدلال پر ہے۔ استدلال وہ طریق ہے جس سے کوئی بھی شخص اپنی علمی و فکری بساط کے مطابق کسی بھی نئی صورتِ حال سے نبرد آزما ہوسکتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی علوم اب تک پروان چڑھے ہیں، سب عقل ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ دیئے ہوئے مقدمات میں سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی عقل کی اہم صورت ہے۔ ارسطو کی منطق میں ایک اہم مثال دی گئی ہے:

تمام انسان فانی ہیں۔

سقراط ایک انسان ہے۔

لہٰذا سقراط فانی ہے۔

اس منطقی استدلال میں پہلے دو مقدمات میں سے تیسرا نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ ان کو ترتیب دینا اور پھر نتیجے اخذ کرنا استدلال ہی ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے کہ تمام علوم کا دارومدار حسی ادراک کے بعد عقلی استدلال پر ہے۔

3- استناد (Authority)

ہم عموماً مشاہدہ اور تجربہ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات براہ راست مشاہدہ اور تجربہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے دیگر ذرائع سے مدد لینا پڑتی ہے۔ یہ ذرائع، کتب، رسائل، ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، قدیم سکے، آثار قدیمہ و شخصیات وغیرہ ہیں۔ ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے علاوہ کسی بھی ذریعہ یا طریقہ سے حاصل کردہ شہادت، استنادیت کا درجہ رکھتی ہے۔

طلبہ و طالبات کے لیے اساتذہ، بچوں کے لیے والدین، مریدوں کے لیے پیر، مریض کے لیے ڈاکٹر عوام کے لیے سیاسی راہنما اور حکمران مستند شخصیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا کہا، علم میں اضافہ کرتا ہے اور سننے والا اس پر پختہ یقین رکھتا ہے۔

عقیدہ یا یقین (Faith or Belief) بھی استنادیت میں ذیلی ماخذ علم ہے۔ یعنی اگر کسی پر عقیدہ نہ ہو تو پھر معلومات حاصل نہیں ہوسکتیں۔ عقیدہ رکھنا اور عقیدے کا پختہ ہونا۔ انسان کو کسی مشاہدہ و تجربہ کا مکمل علم دینے میں مدد دیتا ہے۔

اس ماخذ علم میں چند ایک اہم نکات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ واقعہ کے ہونے اور بیان کرنے کا درمیانی وقفہ جتنا کم ہوگا اتنی ہی شہادت یا بیان زیادہ صحیح ہوگا۔

شہادت، گواہی یا بیان دینے والے کا تجربہ اور کردار بھی جانچنا چاہیے۔ اور یہ بھی خیال کیا جائے کہ آلات کا استعمال ہوا ہے کہ نہیں۔ کیونکہ فی زمانہ سائنسی آلات کا استعمال کرنے سے وقت اور دولت کی بچت ہو جاتی ہے۔

ہم اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر تمام معلومات حاصل نہیں کرسکتے۔ علم کا حصول بھی ہر جگہ اور ماضی میں جا کر حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہمیں کسی نہ کسی ہستی یعنی Authority کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ دوسروں پر اعتماد کرنا وقت کی ضرورت اور مجبوری ہوتا

ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح حاصل کردہ علم میں کہیں نہ کہیں نقائص ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود استنادیت ایک اہم ماخذ علم ہے۔ تاریخی واقعات، حادثات، علوم وفنون، ماضی میں گزرے ہوئے جملہ فلسفیوں کے فلسفیانہ افکار سب اسی مآخذ کے مرہون منت ہیں۔ ہم جس طرح ماضی میں جا کر علم حاصل نہیں کر سکتے اسی طرح دنیا کے مختلف مقامات لندن، جدہ، نیویارک، انقرہ، دہلی، کراچی، قاہرہ، تہران، بیجنگ وغیرہ کے بارے میں تمام علم حاصل نہیں کر سکتے۔ مختلف ہستیوں، ماہرین علم وفن کی تحریروں سے استفادہ کرکے علم حاصل کیا جاتا ہے۔

4- وجدان (Intuition)

عقلی تجربات سے گزر کر انسان ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں عقل وخرد ساتھ نہیں دیتے لیکن وہ مزید کچھ جاننے کی خواہش رکھتا ہے۔ چھٹی حس کی اصطلاح اسی مرحلے کے لیے استعمال کی جاتی ہے کہ انسان حواس خمسہ سے آگے جا کر بعض فیصلے کرتا ہے۔ فلسفی، مفکر، سائنس دان، شاعر اور ادیب وجدان ہی کی مدد سے فوری نتیجہ نکالتے ہیں۔

ہم روزمرہ زندگی میں اچھے یا بُرے کا انتخاب یا فیصلہ وجدانی کیفیت ہی میں کرتے ہیں۔ جج کسی مقدمہ کا صحیح فیصلہ وجدان سے ہی کرتا ہے۔ یہ ذریعہ علم انسان کو زندگی میں مختلف النوع حقیقتوں کو جاننے میں مدد دیتا ہے۔ سقراط کا کہنا تھا کہ مجھے ایک خاص قسم کی طاقت کنٹرول کرتی ہے۔ یہ یقیناً وجدانی کیفیت ہی ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں وجدان کی تعریف کرتے ہوئے یوں لکھا ہے کہ:

> "It is a real, distinct and clear source of knowledge, it is personal and private experience. Intuitive experience cannot be conveyed to others."
>
> ''یہ ایک حقیقی منفرد اور واضح ذریعہ علم ہے۔ یہ شخصی اور ذاتی تجربہ ہے۔ وجدانی تجربہ دوسروں کو بتایا نہیں جاسکتا۔''

وجدانی تجربہ چونکہ ذاتی ہوتا ہے اس لیے کوئی دوسرا کسی کا تجربہ سمجھ یا جان نہیں سکتا اور یہ وجدانی تجربہ فوری ہوتا ہے۔ لیکن سب کو نہیں ہوسکتا۔ صوفی بے حد محنت و ریاضت سے اس مقام پر پہنچتا ہے۔ لیکن وہ بھی جو کچھ حاصل کرتا ہے اس طرح آگے بیان نہیں کرسکتا۔ صوفی وجدانی تجربہ میں انتہائی حد تک پہنچتا ہے اور پھر آگے نکل جاتا ہے۔ وجدانی تجربہ انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ اس کی حسّی تجربہ کی طرح تصدیق نہیں ہوسکتی۔

5- وحی والہام Revelation

مذہبی نقطۂ نظر سے وحی یا الہام کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندے یعنی رسول کی معرفت الہامی علم دیگر انسانوں کو پہنچاتا ہے۔ وحی یا الہام میں تین نکات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں:

1- وحی یا الہام کے ذریعے ظاہری حواس سے مخفی اشیا سے متعلق علم حاصل ہوتا ہے۔
2- یہ وہ طریق یا ذریعہ علم ہے جو حواس اور منطقی و عقلی استدلال سے ماورا ہے۔

3- الہامی علوم کا انسانی زندگی کے ہر پہلو سے تعلق ہوتا ہے تا کہ وہ عملی نظامِ حیات کی بنیاد بن سکیں۔

وحی یا الہام نوعیت کے لحاظ سے اعلیٰ و برتر مآخذ علم ہے، جس کے اہل صرف اور صرف نبی ہی ہوتے ہیں۔

الہام یا وحی ایک ایسا ماخذ علم ہے جو اہم ترین اور اعلیٰ و مقتدر ہستیوں کے لیے ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ الہام کی منزلوں تک صرف خاص الخاص شخص ہی پہنچتا ہے۔ جسے مذہبی زبان میں نبی کہا جاتا ہے۔ اس تجربہ کے کئی ایک درجے ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ نے وجدان اور الہام کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان میں نوعیت کا نہیں بلکہ درجے کا فرق ہے۔ وجدانی کیفیتوں کے انتہائی درجوں کو چھونے کے بعد الہامی کیفیت ہوتی ہے۔ صوفی، ولی، مفکر، فلسفی، وجدان کی انتہائی کیفیتوں تک پہنچ کر آگے نکل جاتے ہیں لیکن الہام کی انتہائی کیفیتوں تک صرف نبی ہی پہنچتا ہے۔ وہ عقل فعال (Active Intellect) کی مدد سے پیغامات وصول کرتا ہے۔ اس میں باطنی اور ذاتی تجربہ ہوتا ہے۔ ماخذ علم میں اس کا انتہائی درجہ ہے جس میں بے شمار انسانی قوتیں کام کرتی ہیں۔ یہ تجربہ بھی جیسے محسوس ہوتا ہے اسی طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آگے پیغام لوگوں کی سمجھ بوجھ والی زبان میں دیا جاتا ہے۔ یعنی آگے کلام کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ اسے کیسا تجربہ ہوا۔ کس سے کس طرح کا رابطہ ہوا بیان سے ماورا ہے۔

الہامی کیفیتیں کسی دوسرے کی سمجھ بوجھ کے لیے قطعی مشکل بلکہ ناممکن ہوتی ہیں اس لیے ہر عالم اپنی سوچ و بچار اور عقل کے مطابق تاویلیں کرتا ہے۔ اس میں تاویلیں کرتے ہوئے مختلف علماء کی اپنی اس علمی و فکری بساط کے مطابق اُن کے نقطہ نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے مذہبی بحثیں جنم لیتی ہیں۔

بہت سارے حسّی تجربات مل کر ایک استدلال بناتے ہیں اور استدلال عقل سے ممکن ہے۔ بہت سارے عقلی تجربے اور استدلال مل کر ایک وجدانی تجربہ پیدا کرتے ہیں۔ اور متعدد وجدانی تجربات و کیفیتیں مل کر الہامی کیفیت کی ابتدا کرتی ہیں۔

کوئی بھی وجدان کبھی بھی عقلی استدلال اور حسّی تجربہ کے بغیر ممکن نہیں۔ یعنی ہر تجربہ مرحلہ وار ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ حسّی تجربہ نہ ہوا ہو تو وجدانی تجربہ ہو جائے۔ جس درجے کا جو شخص ہوگا اسے ویسا ہی تجربہ ہوگا۔ ہر شخص کی جسمانی اور دماغی ساخت، کیمسٹری اور صحت ذہنی کے مطابق تجربہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا علم ادنیٰ و کمتر درجہ والوں کو سمجھ نہیں آسکتا۔

نظریاتِ علم (Theories of Knowledge)

علم کے مختلف نظریات ہر دور میں پروان چڑھتے رہے ہیں۔ فکری و عقلی مدارج کے مطابق متعدد نظریاتِ علم قائم کیے جا چکے ہیں جن میں سے دو سب سے اہم ہیں۔ جدید فلسفیوں نے علم کی بنیاد عمومی طور پر انہیں پر رکھی ہے۔ یہ نظریاتِ علم عقلیت اور تجربیت ہیں۔

1- عقلیت Rationalism

عقلیت سے مراد استدلال کے ذریعہ سے علم حاصل کرنا ہے۔ مختلف مکتبہ فکر کے فلسفیوں نے ہمیشہ فلسفیانہ افکار کی بنیاد عقل و خرد پر رکھی۔ یونانی فلسفی افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotle) عقلیت کے بڑے علمبردار ہیں۔ کانٹ (Kant) کے تنقیدی فلسفے میں بھی عقلی دلائل کی انتہا ملتی ہے۔ جدید فلسفے کا بانی ڈیکارٹ (Descartes) اور اسی طرح اسپائی نوزا (Spinoza)،

لائبنیز (Leibnitze) اور ہیگل (Hegel) نے بھی عقلیت کے سہارے اپنے فلسفیانہ افکار بیان کئے۔

جدید ماہرین ریاضی، الجبرا اور سائنس دانوں کے پیش کردہ افکار ونظریات عقل واستدلال پر مبنی ہوتے ہیں۔ عقل ایک اہم ماخذ جس کے ذریعے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔

فلسفہ کے عقلی پہلو سے مراد سائنسی نقطہ نظر سے کسی شے، نظریہ یا عقل کا تجزیہ کرتے ہوئے نظریات یا مفروضے قائم کرنا ہے۔ عقلیت پسندی انسان کو بلاوجہ اندھے اعتقاد، توہم پرستی، تنگ نظری اور جہالت سے بچاتی ہے۔ عقلیت پسندوں نے انسان کو ذہنی الجھاؤ اور گھٹن کے ماحول سے نکال کر آزادانہ ماحول میں سوچ بچار اور فکر وتدبر کی راہ پر ڈال دیا۔

عقلیت سے حالات وواقعات کا جائزہ لینے کے علاوہ نئی علمی، ادبی اور فکری اختراعات کرتے ہیں۔ انسانی ذہنی قابلیت کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ جن کی بنا پر وہ زندگی کے مسائل حل کرتے ہیں۔ جہاں غور وفکر اور سوچ بچار سے کام لیا جائے وہاں عقل کا استعمال ضرور ہوتا ہے۔ عقلیت پسندوں کے نزدیک ذہنی قابلیتیں پیدائشی ہوتی ہیں لیکن مشق اور عمل سے ان میں نکھار پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بعض ذہین لوگ مسائل کا حل جلد تلاش کر لیتے ہیں اور بعض غیر معمولی کوشش وتردد سے حقیقت تک پہنچتے ہیں۔ عقل کو سوجھ بوجھ کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ استدلال عقل کے استعمال سے ممکن ہے۔ ہر بامقصد فکر کی انتہا منطقی استدلال پر مبنی ہوتی ہے۔ کیونکہ حقائق پر مبنی صحیح نتیجہ استدلال ہی سے ممکن ہے۔ استدلال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک استخراجیہ اور دوسرا استقرائیہ۔

مثلاً:

تمام انسان فانی ہیں۔

اسلم ایک انسان ہے۔

لہٰذا اسلم فانی ہے۔

''تمام انسان فانی ہیں'' مقدمہ کبریٰ ہے اور ''اسلم ایک انسان ہے'' مقدمہ صغریٰ ہے۔ ان سے نتیجہ ''اسلم فانی ہے'' نکالا گیا ہے۔ مقدمہ کبریٰ کلیہ موجبہ ہے اور نتیجہ جزئیہ موجبہ ہے۔ اسی طرح استخراجیہ استدلال میں کل سے جز کی طرف جایا جاتا ہے۔ یعنی کلیہ موجبہ میں انسان کی کل جماعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ اسلم اس کل کا ایک جز ہے۔ نتیجہ میں انسان بڑی جماعت کے ایک جز اسلم کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح استدلال استقرائیہ میں ہم جزئیات کو سامنے رکھ کر ''کل'' کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

استقرائیہ میں چند ایک جزئیات کو سامنے رکھ کر استقرائی زقند لگائی جاتی ہے۔ استقرائیہ کی بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر استخراجی عمل ممکن نہیں۔ اس میں حقائق کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جزئیات کو جمع کرنا بھی ایک اہم سائنسی طریقہ کار ہے۔ استدلال استقرائیہ اجزا سے کل کا نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ مثلاً

اسلم فانی ہے، زید فانی ہے، عمر فانی ہے۔

لہٰذا تمام انسان فانی ہیں۔

استقرائی استدلال میں حاصل کردہ مقدمات محض جزوی جواز مہیا کرتے ہیں۔ عقلیت ہی کی مدد سے طبیعی علوم میں اسی قسم کا استقرائی استدلال کیا جاتا ہے۔ جزئی حقائق کے مشاہدے سے نتائج حاصل کئے جاتے ہیں۔ چند ایک واقعات کو دیکھ کر کل کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔ اس طریق کار کو سائنسی طریقہ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے سائنس میں عقل کا عمل دخل بے حد ہے یعنی سائنس میں کوئی بھی مفروضہ عقلی استدلال کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔

عقلیت میں استخراجی اور استقرائی دونوں طریقہ ہائے استدلال کے ذریعے علم حاصل کیا جاتا ہے۔ علم کے حصول میں عقلی موشگافیوں اور فکری انگیختوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔

کوپرنیکس، کیپلر اور گلیلیو نے بھی عقلیت کی بنا پر اس بات کو یقینی جانا کہ ریاضی سے کائنات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ان فلسفیوں کے افکار میں پائی جانے والی عقلیت پسندی کی فلسفیانہ تشکیل جدید فلسفی ڈیکارٹ کے افکار میں واضح ملتی ہے اس نے سوچ و بچار سے علم کی بنیاد رکھی۔ ڈیکارٹ کا مشہور عقلی مقولہ ''میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں'' "I think therefore I am" عقلی استدلال کی سب سے بڑی مثال ہے۔

2- تجربیت (Empiricism)

تجربیت بھی حصول علم میں اہم مکتبہ فکر ہے۔ اس سے مراد علم صرف اور صرف حسی تجربات سے ممکن ہے۔ حسی ادراک تمام علوم کی بنیاد ہے۔ یعنی سب سے پہلے حسی تجربہ ہوتا ہے اور اس کے بعد عقلی جواز مہیا کیا جاتا ہے۔

حس ایک سادہ تجربہ ہے۔ جو ہمارا روزانہ کا معمول ہے۔ یہ ایک وقوفی عمل ہے۔ ہم آلات حس کے ذریعے کسی بھی مادی شے کے مختلف پہلوؤں سے متعلق سادہ ترین تجربات حاصل کرتے ہیں۔ حسی تجربہ میں علم کسی مدرکہ شے کے معنی حاصل کر کے وقوف کا درجہ پاتے ہیں۔ یہ بالکل ابتدائی مرحلہ ہے جس میں کوئی بچہ پہلی دفعہ ابتدائی علم حاصل کرتا ہے پہلی دفعہ کسی شے کو دیکھ کر اس کو کوئی معنی دیتے ہوئے اس کے بارے میں جانا جاتا ہے۔ کسی کھلونے، پھل، یا ٹافی وغیرہ کو پہلی دفعہ جب بچہ دیکھتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل، جسم، چمک، رنگ اور دیگر خاصیتوں کا ملا جلا بالکل بنیادی سا علم حاصل کرتا ہے۔ پھر کسی کے بتانے پر اس کا نام لیتا ہے۔ اس کا نام لینے یا کہنے کو ہی اسے معنی دینا کہا جاتا ہے۔

انسان حواس خمسہ کی مدد سے حسّی تجربہ حاصل کرتے ہیں دراصل یہ پانچ بیرونی حواس ہیں یعنی دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا۔ ان کے علاوہ اندرونی حواس بھی ہیں یعنی بھوک، پیاس، دکھ، نفرت، محبت اور درد وغیرہ۔ جان لاک کے خیال میں اندرونی حواس تین ہیں: احساس کرنا (Feeling)، خواہش کرنا (Desiring) اور ارادہ کرنا (Willing)۔ آلاتِ حس اندرونی بھی ہوتے ہیں اور بیرونی بھی، بیرونی آلاتِ حس ناک، کان، زبان، آنکھ اور جلد ہیں۔ جبکہ اندرونی آلات حس، دل، جگر، معدہ اور آنتیں وغیرہ ہیں۔

جلد کے بیرونی حصے ایک خول کا کام دیتے ہیں۔ بیرونی حصے حساس نہیں ہوتے۔ ہم تمام حسّی تجربے نظام عصبی کی بدولت حاصل کرتے ہیں۔ اگر کہیں اعصاب میں نقص یا رکاوٹ ہو تو ہمیں متعلقہ حسّی تجربہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ گویا نظام عصبی ہی اس ابتدائی علم کو حاصل کرنے کا اصل ذریعہ ہے۔ آنکھ، آلہ حس ہے۔ آنکھ بصری عصب کو اطلاع پہنچاتی ہے۔ آنکھ کے پردے پر شکل بنتی ہے اور دماغ

دیکھنے میں مدد دیتا ہے یا کنٹرول کرتا ہے۔ اسی طرح کان آلہ حس ہے۔ کان کے اندرونی حصے میں طبل گوش ہے اور کان کی نالی ہے۔ ہوا میں ارتعاش پیدا ہو کر سمعی نالی کے ذریعے ارتعاش ہتھوڑے نما ہڈی پر سنائی دیتی ہے اور یہ سمعی حس بھی دماغ کی مدد ہی سے سنائی دیتی ہے۔

حس کی ماہیت یہ ہے کہ ہر حس شعور کی ابتدائی شکل ہے۔ جو ہر عضو میں موجود ہے۔ حس ایک وقوفی عمل بھی ہے جو خارجی دنیا اور داخلی عضویاتی کیفیات کا علم دیتی ہے۔ حس اس وقت وجود میں آتی ہے۔ جب بیرونی یا اندرونی مہیج سے کوئی آلۂ حس متاثر ہوتا ہے۔ حس ہمیشہ دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔ اور حس ہی کے ذریعے دماغ پہلی مرتبہ خارجی دنیا سے آشنا ہوتا ہے۔ حس ایک مجرد (Abstract) ذہنی عمل ہے کسی خالص حس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ ہمیشہ کسی شے یا کسی کیفیت سے متعلق ہوتی ہے۔ ہر حس کے لیے ایک خاص آلہ حس ہوتا ہے۔ چونکہ حسّی تجربہ ہم دماغ ہی سے حاصل کرتے ہیں اس لیے ہر حس دماغ کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

کیفیت، شدت وسعت، زمانیت اور مقامی نشانات حس کی کیفیات ہیں۔ بامعنی حس کو ادراک کہتے ہیں۔ ادراک (Perception) کے معنی علم حاصل کرنا ہے۔ جتنا ہمارا ادراک وسیع ہوگا اتنا ہی علم میں اضافہ ہوگا۔ ادراک کے مختلف مدارج ہیں۔ جن سے گزر کر ہمیں مکمل ادراک حاصل ہوتا ہے۔ یہ مکمل ادراک تجربہ پر مبنی ہوتا ہے۔ ادراک کا پہلا درجہ خالص ادراک ہے دوسرا مخلوط ادراک اور تیسرا علامتی ادراک ہے۔

غلط ادراک کو التباس (Illusion) کہتے ہیں۔ ارسطو نے ایک مثال بیان کی تھی کہ دور سے ایک چیز آتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایسے لگتی ہے جیسے کوئی گائے ہو۔ تھوڑی سی قریب آئے تو ایسا لگتا ہے کہ گائے نہیں کوئی اجنبی شخص ہے اور قریب آئے تو کوئی شناسا سا شخص معلوم ہوتا ہے۔ جب بالکل قریب آ جائے تو وہ اپنا دوست ہوتا ہے۔ اب اگر اس مثال پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ گائے نظر آنے سے لے کر اپنا دوست نظر آنے تک وہ شخص تو وہی ہے جو دور سے ہماری طرف آ رہا ہے۔ جب اسے پہچان لیا کہ فلاں دوست ہے تو اس کا مکمل ادراک حاصل ہوا اور جسے گائے اور اجنبی شخص نظر آتا ہے، غلط ادراک یا ہمارا التباس ہے؛ اسی طرح بعض اوقات ہمیں کسی شے کے غیر موجود ہونے کے باوجود کچھ دکھائی دینا ادراک نہیں بلکہ ہمارا وہم (Hallucination) ہے۔

اگر کوئی شے موجود ہو اور صحیح حس پیدا ہو تو صحیح اور مکمل ادراک حاصل ہوتا ہے اور اگر کوئی شے موجود ہو، اور غلط حس پیدا ہو تو التباس یا غلط ادراک حاصل ہوتا ہے اور اگر کوئی شے موجود ہی نہ ہو اور کوئی حس پیدا ہو تو یہ نہ تو ادراک ہے اور نہ التباس بلکہ یہ وہم ہے۔ جیسے نشہ کرنے والوں کو ایک شے کی بجائے دو دو نظر آتی ہیں۔ یا بغیر کسی آواز کے آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

اس بات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حسّی تجربہ میں کئی ایک نقائص ہیں۔ اگر کسی شخص کو حسّی تجربہ نہ ہو تو وہ کسی قسم کا کوئی تصور پیدا نہیں کر سکتا۔ مثلاً اگر کوئی شے دیکھی نہ ہو تو جاگتے یا سوتے اس کا کسی طور تصور ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

عقلی استدلال اور تجربیت کا ہمیشہ سے ہی آپس میں فکری مناقشہ رہا ہے۔ تجربیت پسند وہبی خیالات (Innate Ideas) کو صحیح نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ ہی کی وجہ سے انسان صحیح علم حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یونانی فلسفہ میں سوفسطائی تجربیت کے قائل تھے۔ جبکہ فلسفہ جدید میں بیکن (Bacon) ہابز (Hobbes)، جان لاک (John Locke) برکلے (Berkeley)

اور ہیوم (Hume) کے نظریات تجربیت کے مکتبہ فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔

برکلے (Berkeley) کے خیال میں خارجی اشیا کے علم کا انحصار خود ہمارے داخلی تفکر اور ذہنی سوچ پر مبنی ہے۔ ہم اشیا کا علم حاصل نہیں کرتے بلکہ محض ان کی حسی صفات کا ادراک حاصل کرتے ہیں۔ برکلے (Berkeley) حسّی صفات، ادراک اور ذہن کی اصلیت وحقیقت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اشیا کے مستقل وجود کو نہیں مانتا۔ ہیوم (Hume) نے اس نقطۂ نظر کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح خارجی اشیا کے مستقل وجود کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے بلکہ محض حسّی صفات ہی وجہ سے ان کے ہونے کو مانتے ہیں۔ اسی طرح ذہن کی مستقل حیثیت معلوم نہیں بلکہ صرف ذہنی اعمال کی وجہ سے ہی ذہن کو مانتے ہیں۔ ہیوم (Hume) نے تجربیت کو فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کیا کہ وہ تشکیک کا شکار ہو گیا۔

جدید فلسفی لاک کا خیال ہے کہ حواس ہمیں خارجی علم مہیا کرتے ہیں جبکہ تفکر ہمیں داخلی کیفیاتِ ذہنی کا پتہ دیتا ہے۔ برکلے کا خیال ہے کہ خارجی اشیا کے علم کا انحصار خود ہمارے داخلی تفکر اور ذہن پر ہے۔ بلکہ کسی شے کا موجود ہونا بھی ادراک ہی سے ممکن ہے۔ برکلے کے خیال میں اشیا کا علم حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہم محض اشیا کی حسی صفات کا ادراک حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح ڈیوڈ ہیوم کا کہنا ہے کہ جو شے ہمارے تجربے میں آتی ہے۔ وہ حسّی صفات اور ان سے پیدا ہونے والے حسّی تجربات ہی ہیں۔

تجربیت کے ماننے والوں کا نقطہ نظر واضح ہے کہ جس شے کا ہمیں تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعے علم حاصل نہ ہوا ہو ہم اس کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتے۔ بلکہ خواب بھی کسی ایسی شے کا نہیں دیکھ سکتے جس کا پہلے تجربہ نہ ہوا ہو۔ پیدائشی اندھے کو سرخ یا کسی بھی رنگ کا تصور ذہن میں نہیں آ سکتا۔ اس نے کبھی رنگ دیکھا ہی نہیں وہ اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح پیدائشی بہرہ آواز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ اسے اس کا تجربہ ہی نہیں ہوا۔ لہٰذا تجربہ کی بنا پر علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حسّی ادراک میں نقائص پائے جاتے ہیں۔ جیسے التباس اور واہم وغیرہ۔

امام الغزالیؒ کا تصورِ علم (Imam AlGhzali's Concept of Knowledge)

مسلم فلسفی حجۃ الاسلام ابو حامد الغزالیؒ نے اپنی کتاب ''احیا العلوم الدین'' کی جلد اوّل میں فلسفہ علم تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سیکھنے کے عمل سے گزرتے ہوئے علوم کی ترتیب کا خیال رکھا جائے اور بتدریج علوم سکھائے جائیں۔ علم ہی کو فضیلت حاصل ہے۔ انسان جانوروں سے علم ہی کی وجہ سے منفرد ہے اور انسان اسی وقت اشرف المخلوقات کہلائے گا جب اس میں شرف یعنی علم موجود ہوگا۔ انسان کی شرافت صرف علم کی رو سے ہے اور اسی علم کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔

علم کے درجے

امام الغزالیؒ کے نقطہ نظر کے مطابق علم کو چار بڑے درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

درجہ اوّل: انبیاء کا منصب اور کام سب سے ارفع اور اعلیٰ ہے کیونکہ وہ بغیر کسی اختصاص کے اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عالم انبیاء کے وارث ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی رتبہ نبوت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس لئے

امام الغزالیؒ کے خیال میں علم کا سب سے اعلیٰ درجہ انبیا کا علم ہے۔ وہی اس کو جان اور سمجھ سکتے ہیں کیونکہ انسانوں میں ان کا درجہ سب سے برتر ہے۔ یقیناً برتر کا علم بھی اعلیٰ کیفیت کا ہوگا کیونکہ انبیاء باطن کا تزکیہ بھی فرماتے ہیں۔

درجہ دوم: خلفاء وملوک کا کام معاشرے کی بہتر تعلیم وتربیت کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اختیارات اور قانون کی رو سے معاشرہ کی تربیت کا اہتمام کرتے ہیں۔ ظلم کو قوت سے روکتے ہیں۔ انبیاء کرام کے بعد کا درجہ خلفاء وملوک کا ہے۔ اس لئے وہ اس درجہ کے علم کے حامل ہوتے ہیں۔

درجہ سوم: علمائے ربانی اپنے انداز سے علمی وفکری نکات کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس درجہ کا علم رکھنے والے علما سے صرف خواص ہی استفادہ کرتے ہیں۔ وہ عوام کی بجائے چند اعلیٰ نفوس کی اصلاح کرتے ہیں جو معاشرتی فلاح و بہبود کا کام کرتے ہیں۔

درجہ چہارم: امام الغزالیؒ کے بتائے ہوئے علم کے چوتھے درجے میں واعظین آتے ہیں۔ واعظ کا کام فکر ونظر سے علم کی وضاحت کرنا ہوتا ہے۔ منطقی طریق کار سے اپنی تقاریر سے علم کے فوائد کی عملی صورت پیدا کرنا ہوتی ہے۔ عوام کی دینی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی باطنی وظاہری تربیت کی جاتی ہے۔ واعظ میں عوام الناس کی معاشرتی واخلاقی حالت بہتر بنانے میں مدد دی جاتی ہے۔

امام الغزالیؒ کے نزدیک علم کی اہمیت وافادیت یہ ہے کہ انسان ولایت وکشف کی سطح تک پہنچ جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو پالیتا ہے۔ علم کی حقیقت ہی انکشاف ہے اور اس انکشاف سے مراد اللہ تعالیٰ کے بارے میں جاننا ہے۔ امام الغزالیؒ صوفی تھے۔ تصوف میں علم کی بے حد اہمیت ہے، جو یقین کے مراحل طے کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ یقین کا درجہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کے تین درجے ہیں:

۱۔ علم الیقین: اس درجے میں دنیاوی معاملات کو ان کے احکام کے ساتھ جانا جاتا ہے۔ علم الیقین عالموں کا درجہ ہے۔

۲۔ عین الیقین: جس کا مطلب حالتِ نزع اور وقتِ رحلت کا علم ہے۔ عین الیقین عارفوں کا درجہ ہے۔

۳۔ حق الیقین: اس درجے میں جنت میں خدا کے نمودار ہونے اور اس کے احوال اور کیفیت کو جاننا ہے۔ حق الیقین محبانِ حق کی فنا کا درجہ ہے۔

علم الیقین مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے، عین الیقین محبتِ الٰہی سے اور حق الیقین مشاہدۂ حق سے۔

عظیم مسلم فلسفی امام الغزالیؒ کے خیال میں تصوف علم وعمل کا امتزاج ہے۔ یعنی تصوف میں عمل کے ذریعے علم حاصل ہوتا ہے۔ اشیا کا علم ہمیں حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ محسوسات، معقولات اور روایات کی بنیاد پر علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن بعض اوقات غور وفکر کے بغیر اچانک ہمیں کسی شے کا ادراک ہو جاتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے وجدان یا کشف کہا جاتا ہے۔ یہ کشف دل کی ایک مخصوص کیفیت ہے جو مجاہدے اور تزکیہ نفس کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔

امام الغزالیؒ کا خیال ہے کہ جو شخص خود علم حاصل کرتا ہے، اُسے چاہیے کہ وہ اس علم کی ترسیل کرے اور دوسروں کو بھی سکھائے۔ ایسا کرنے کے لئے حکمت ودانائی کی ضرورت ہے۔ جو کوئی شخص لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا ہے، اس کی بخشش وکامیابی کے لیے اللہ خود مدد کرتا ہے۔ غزالی کے نقطۂ نظر کے مطابق علم روح کی غذا ہے۔ علم کی فضیلت اضافی نہیں بلکہ حقیقی اور اصلی ہے۔ جس شخص کے دل

میں علم کی طلب موجود نہیں وہ سمجھ لے کہ وہ بیمار ہے۔

امام الغزالیؒ کے افکار کو مدنظر رکھیں تو علم کے اہم مقاصد یہ بنتے ہیں کہ علم سے آخرت کی معرفت کا حصول ممکن ہے۔فکرِ آخرت کی نشو ونما بھی علم ہی کے باعث ہوتی ہے۔علم معرفتِ الٰہی، رضائے خداوندی، انسانی اعلیٰ کردار کی تشکیل اور انسانی شخصیت کے ظاہر و باطن میں توازن قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

علم کی اقسام: امام الغزالیؒ نے عمومی طور پر علم کو دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا ہے۔وہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ''احیاء العلوم'' کی جلد اوّل میں علوم کی تقسیم اور فضیلت کا ذکر کرتے ہیں۔ان کے خیال میں پہلی قسم علم محمود اور دوسری علم مذموم ہے۔ان کے نقطۂ نظر کے مطابق علم ہمیشہ بامقصد ہوتا ہے۔دراصل علم کی اس تقسیم سے مراد علم کا استعمال ہے۔اگر علم کو علم برائے زندگی، برائے ترقی انسان، فلاحِ عامہ اور رضائے الٰہی کے لیے استعمال کیا جائے تو یقیناً یہ علم محمود ہے اور اگر علم کو انسانیت کی تذلیل اور خدا سے دوری کے لیے استعمال کیا جائے تو اسے علم مذموم کہا جائے گا۔علم محمود کو مزید دو اقسام فرضِ عین اور فرضِ کفایہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔اسلام کے بنیادی ارکان اور عقائد سے فرضِ عین اور انسانی مرضی کے عمل دخل سے حاصل کردہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ، علم الکلام، طِب، ریاضی، صنعت و حرفت، زراعت، پارچہ بافی، کاشتکاری وغیرہ فرضِ کفایہ ہیں۔

آدابِ علم: امام الغزالیؒ کے تصورِ علم کی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے طالب علم کے لئے علم حاصل کرنے کے آداب بیان کیے ہیں۔وہ اپنی تصنیف احیاء العلوم کے حصہ اوّل کے پانچویں باب میں طالب علم کے لیے دس آداب کا ذکر کرتے ہیں جن کو اپنا کر وہ مثالی طالب علم بن سکتا ہے۔انہوں نے یہ دس آداب یوں درج کیے ہیں:

1- طالب علم اپنے نفس کو رذیل عادات اور بری صفات سے پاک کرے۔اس لیے کہ علم دل کی عبادت اور باطن کی درستی اور اس کا نزدیک ہونا خدا تعالیٰ سے ہے۔
2- طالب علم دنیا کے شغل کے علاقے کم کردے یعنی زیادہ مسائل میں گھرنے سے اجتناب کرے۔
3- علم پر تکبر نہ کرے اور استاد سے عزت و احترام سے پیش آئے۔استاد کی نصیحت کو اس طرح مانے جیسے کوئی جاہل بیمار اپنے طبیب مشفق کی مانتا ہے۔
4- طالب علم ابتدا میں لوگوں سے اختلاف سننے سے احتراز کرے خواہ وہ دنیاوی علم حاصل کرنا چاہتا ہو، خواہ آخرت کا۔اس کا سبب یہ ہے کہ اختلاف سننے والے کی عقل متحیر، ذہن پریشان اور رائے سست ہو جاتی ہے نیز ادراک اور اطلاع سے ناامیدی گھر کرتی ہے۔
5- طالب علم عمدہ علوم میں سے کوئی فن سیکھے اور اس میں کمال پیدا کرے جبکہ دیگر علوم سے بھی تھوڑی واقفیت حاصل کرے۔
6- علم کے فنون سے کسی فن کو دفعتاً اختیار نہ کرے بلکہ ترتیب کے لحاظ سے جو اہم ہو، اسے شروع کرے۔
7- کسی فن میں اس وقت تک قدم نہ رکھے جب تک کہ اس سے پیشتر کے فن کو پورا نہ کرلے۔علوم میں ترتیب اور مرحلہ وار آگے بڑھنا چاہیے۔

8- طالب علم اس سبب کو معلوم کرے جس سے علوم کا شرف حاصل ہوتا ہے۔
9- طالب علم اپنے باطن کو آراستہ اور فضیلت سے مزین کرے تا کہ خدا کا قرب حاصل کر سکے۔
10- اصلی مقصود معلوم کرے تا کہ مرحلہ وار منزل حاصل کی جا سکے۔

عظیم مسلم مفکر و صوفی امام الغزالیؒ کا خیال ہے کہ جس طرح جسم کو چند روز خوراک نہ ملے تو اس کی موت واقع ہو سکتی ہے، بالکل اسی طرح قلبِ انسانی کو اگر چند روز علم کی غذا نہ ملے تو اس کی بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ جس شخص کے دل میں علم کی خواہش موجود نہیں، وہ سمجھ لے کہ وہ بیمار ہے۔

امام الغزالیؒ کا نقطۂ نظر ہے کہ جو شخص خود علم حاصل کرتا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ یہ علم دوسرے تک پہنچائے۔ امام الغزالیؒ علم کو انسان کے مختلف مسائل کے حل کا وسیلہ تصور کرتے ہیں۔ علم سے زندگی کے اسرار و رموز کا پتہ چلتا ہے۔ علم سے حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ خدا کو علم ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ فکر کی بلند ترین صورت خدا کی ذات و صفات کے بارے میں غور و فکر ہے جس سے خدا سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ خدا سے مکمل محبت عرفانِ ذاتِ باری سے ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص انکشاف کی اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ خدا کا علم حاصل کرتا ہے۔

امام الغزالیؒ کے تصورِ علم کے مطابق انسان کو اپنی ذات کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ خدا شناسی ہوتی ہے۔ آخرت کی معرفت کا حصول اور فکرِ آخرت کی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔ جہاں خدا شناسی کے لیے تگ و دو کی جاتی ہے وہاں صرف علم ہی معرفتِ الٰہی کے حصول کو آسان بناتا ہے۔ جہالت کی بجائے علم کی روشنی انسان کو رضائے خداوندی کے ساتھ ساتھ انسانی شخصیت کے ظاہری و باطنی رموز سے بھی واقف کرتی ہے۔ مثالی کردار کی تشکیل نفس کو برائیوں سے پاک کر کے کی جاتی ہے، یہ صرف علم ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ استاد اور شاگرد کا مقدس رشتہ بھی اسی لیے زیادہ اہم ہے کہ تعلیم کے عمل میں استاد اہم کردار ادا کرتا ہے۔ استاد پیغمبرانہ میراث کا حامل ہوتا ہے۔ طالب علم کی علمی اور فکری رہنمائی استاد ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ اس لیے علم کا حاصل کرنا اسلامی تعلیمات کے مطابق تعلیم حاصل کرنا یقیناً اعلیٰ کردار کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔

مشقی سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1:۔ علم سے کیا مراد ہے؟
2:۔ عقلیت کی حقیقت کیا ہے؟
3:۔ تجربیت اور عقلیت میں فرق بیان کریں۔
4:۔ وجدان اور الہام کی تصدیق انسانی ذہن نہیں کر سکتا ہے، وضاحت کریں۔
5:۔ کیا استناد بھی ماخذِ علم ہے، وضاحت سے بتائیں۔
6:۔ امام الغزالی کا فلسفۂ علم بیان کریں۔

معروضی طرز (Objective Type)

سوال 1:۔ مناسب اور ضروری اصطلاحات یا الفاظ سے خالی جگہ پر کریں۔

1:۔ ارسطو کے خیال میں علم ایک ایسا تجربہ ہے جو.............. سے شروع ہوتا ہے۔

2:۔ پیغمبر سے رابطہ.............. کے ذریعے ہوتا ہے۔

3:۔ عقلیت میں.............. سے کام لیا جاتا ہے۔

4:۔ ''میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں''۔ جدید فلسفی.............. کا مشہور مقولہ ہے۔

5:۔ غلط ادراک کو.............. کہتے ہیں۔

6:۔ تجربیت پسند صحیح نہیں مانتے.............. خیالات کو۔

7:۔ جدید فلسفی لاک کا خیال ہے کہ ''حواس ہمیں خارجی.............. سے آشنا کرتے ہیں۔

8:۔ وجدان حقیقی، منفرد اور واضح ذریعہ.............. ہے۔

9:۔ استنادیت میں کسی.............. سے متاثر ہوا جاتا ہے۔

10:۔ یقین بھی ذیلی آخذِ علم ہے.............. میں۔

سوال 2:۔ ذیل میں سوالات کے ممکنہ دیئے گئے ہیں جوابات میں صحیح کی نشاندہی کیجئے۔

1:۔ فلسفے کی کونسی شاخ علم کی وضاحت کرتی ہے۔

1۔ قدریات 2۔ علمیات 3۔ مابعد الطبیعیات 4۔ تصورات

2:۔ یہ کس نے کہا تھا۔ ''علم کو قضیوں میں بیان کیا جاتا ہے۔''

1۔ جان ہاسپرز 2۔ الکندی 3۔ ولیم جیمز 4۔ افلاطون

3:۔ بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ وہبی خیالات انسان میں ہوتے ہیں۔

1۔ پیدائشی طور پر 2۔ حاصل کردہ 3۔ سیکھے ہوئے 4۔ خود ساختہ

4:۔ کسی قضیہ کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار کس پر ہے۔

1۔ تعمیر 2۔ تخریب 3۔ تصدیق 4۔ نقل

5:۔ مکتبہ فکر عقلیت میں جاننے کے لئے کام لیا جاتا ہے۔

1۔ تجربہ سے 2۔ عقل سے 3۔ تحریر سے 4۔ تقریر سے

6۔ مکتبہ فکر تجربیت میں جاننے کے لئے کام لیا جاتا ہے۔

1۔ عقل سے 2۔ تجربہ سے 3۔ سوچنے سے 4۔ گہرائی سے

7:۔ یہ کس کا مقولہ ہے۔"میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں"۔

1۔کانٹ 2۔ڈیکارٹ 3۔کوپرنیکس 4۔گلیلیو

سوال3: کالم"الف" اور کالم"ب" میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم"ج" میں درج کریں۔

کالم"الف"	کالم"ب"	کالم"ج"
☆ ارسطو کا خیال ہے	ابتدائی آخذ علم ہے۔	
☆ سقراط کا خیال ہے	تصدیق نہیں ہوسکتی۔	
☆ وہبی خیالات	تجربہ پر مبنی ہوتی ہے۔	
☆ حسی ادراک	حیرانی و تعجب کا تجربہ علم ہے۔	
☆ وجدان کی	علم صحیح یقین کی تصدیق کرتا ہے۔	
☆ تجربات کی بنیاد	پیدائشی ہوتے ہیں۔	
☆ جان لاک کے خیال میں	طلبا کے لئے استنادیت کا درجہ رکھتے ہیں۔	
☆ وجدان تجربہ	علم سے خودشناسی اور خداشناسی ہوتی ہے۔	
☆ اساتذہ	ذاتی ہوتا ہے۔	
☆ غزالیؒ کے خیال میں	اندرونی حواس تین ہیں۔	

مابعدالطبیعیات (Metaphysics)

شعوری نشوونما کے دوران انسان کے ذہن میں متعدد خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اور کائنات کی حقیقت جاننے کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ کبھی سوچ و بچار سے اور کبھی تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر کائنات کی اصلیت جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح ہر سوال کا کوئی نہ کوئی جواب ملتا چلا جاتا ہے۔

انسان کیا ہے؟ کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی؟ یہ کس طرح بنی؟ اس کی انتہا کیا ہے؟ اور اس کے رموز کیا ہیں؟ ایسے ہی بے شمار سوالوں کے جواب فلسفے کی شاخ مابعدالطبعیات (Meta physics) میں تلاش کئے جاتے ہیں۔ طبیعات کا علم ہمیں مادی اشیا کی حقیقت بتاتا ہے۔ قوت اور طاقت کی وضاحت کرتا ہے۔ جبکہ مابعدالطبیعات اس سے ماوراعلوم کا پتا دیتی ہے۔

مابعدالطبیعیات کے لئے انگریزی زبان میں لفظ (Metaphysics) استعمال ہوتا ہے۔ Meta کے لفظی معنی ہیں "بعد"۔ اسی طرح لفظ میٹافزکس (Metaphysics) کے لغوی معنی مدرکہ اشیاء کی حقیقت یا اصلیت ہے۔

کائنات کی حقیقت یا اصلیت جاننے کے لئے ابتدائے زمانہ ہی سے فلسفیوں نے سوچنا شروع کیا تھا۔ اب تک مختلف فلسفیوں کے متعدد نظریات سامنے آچکے ہیں۔

مابعدالطبیعیات میں دنیا کی حقیقت کے بارے میں عقلی توجیہہ تلاش کی جاتی ہے۔ مابعدالطبیعیات کی ایک اہم شاخ وجودیات (Ontology) ہے۔ وجودیات میں ہستی (Being) کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور خصوصاً مادے، اذہان اور کائنات کے حقائق جانے جاتے ہیں۔

یہ سوال کہ کائنات کیا ہے؟ کیسے بنی؟ اس کے بارے میں مختلف نظریات قائم ہوئے ہیں۔ سائنسی نقطہ نظر پر مبنی جدید نظریات کی مدد سے کائنات میں پنہاں حقیقتوں کی تلاش کی جاتی ہے۔ یہ سوچ و بچار کی جاتی ہے کہ دنیا میں جو شے بھی موجود ہے اس کی علت یا وجہ کیا ہے۔ فلسفے کا دائرکار بے حد وسیع ہے۔ لیکن وجودیات (Ontology) کے زمرے میں آنے والے موضوعات جن سے کائنات کے وجود کا پتا چلتا ہے، درج ذیل ہیں۔

1۔ احدیت (Monism)
2۔ ثنویت (Dualism)
3۔ کثرتیت (Pluralism)

اسی طرح فلسفے کے دو اہم مکاتب فکر درج ذیل ہیں۔

1۔ تصوریت/مثالیت (Idealism) 2۔ مادیت (Materialism)

ذیل میں کائنات کے وجود کے بارے میں نظریات کی ترتیب وار وضاحت کی جاتی ہے۔ ابتدائے زمانہ ہی سے سوچ بچار کا یہی موضوع رہا ہے۔

1۔ احدیت Monism : نظریات کائنات میں سے سب سے ابتدائی اور بنیادی نظریہ احدیت کو لیتے ہیں جو کہ سب سے ابتدائی اور بنیادی نظریہ ہے۔ جس کی رو سے کائنات کی ابتدا کسی ایک جوہر یا عنصر (Substance) سے ہوئی ہے۔

قدیم ایرانی فلسفہ آوستا کے مطابق وجود (Being) آہرامزدا (Ahura Mazda) ازلی وابدی وجود ہے۔ قدیم چینی فلسفہ ٹاؤازم (Taoism) کا ایک فلسفی لچٹسی (Lich-tse) فطرت کو ازل وابد اور نشوونما کو زوال پذیر سمجھتا ہے اور اس کے نقطۂ نظر کے مطابق ایک پُراسرار غیبی طاقت (An Occult Force) زوال کا سبب بنتی ہے۔

یونانی فلسفی تھیلیز (Thales) کا نقطہ نظر تھا کہ کائنات کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔ یونانیوں نے مختلف نظریات کائنات پیش کئے لیکن احدیت کے زمرے میں آنے والا نظریہ فلسفہ یونان کے بانی تھیلیز نے ہی دیا تھا۔ انکسا گورس کا کہنا تھا کہ ذہن (Nous) سے کائنات بنی ہے۔

احدیت کی عمومی طور پر تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلی عینیت یا روحیت (Idealism or Spiritualism) جس کے مطابق کائنات کا جوہر ذہنی یا روحانی ہے۔ دوسری صورت مادیت یا فطرتیت (Materialism or Naturalism) ہے جس کی رو سے جوہر مادی یعنی جسمانی ہے جبکہ ذہن مادہ کی بہتر صورت ہے۔ اس طرح احدیت کی تیسری صورت غیر جانبداریت (Naturalism) ہے جس کے مطابق غیر جانبداریعنی کوئی تیسری صورت ہے جو مادے اور ذہن سے الگ ہے۔

2۔ ثنویت Dualism: کائنات کے ہونے کے بارے میں نظریۂ ثنویت کے مطابق اس کے بننے کی وجہ ایک جوہر نہیں بلکہ دو ہیں اور یہ دو جواہر ذہن اور مادہ ہیں۔ ان کی حیثیت الگ ہے۔ ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتے لیکن کائنات کے معرض وجود میں آنے کا باعث بنے ہیں۔ ذہن، خیال اور نظریہ کی عکاسی کرتا ہے اور مادے کا اظہار اس کی توسیع سے ہوتا ہے۔ ڈیکارٹ اسی نقطہ نظر کا ایک پیروکار تھا۔

3۔ کثرتیت Pluralism: کثرتیت کا نظریہ پیش کرنے والوں کے خیال کے مطابق کائنات کی ابتدا ایک جوہر یا دو جواہر سے نہیں بلکہ زیادہ جواہر سے ہوئی ہے۔ کائنات کو بنانے والے لاتعداد جواہر اپنی اشکال بدلتے رہتے ہیں۔ یونانی فلسفی ایمپیڈکلیز (Empedocles) کے خیال میں کائنات کی تشکیل چار بنیادی عناصر یا جواہر سے ہوئی ہے اور یہ چار بنیادی عناصر پانی، مٹی، آگ اور ہوا ہیں۔ اسی طرح ایک اور یونانی فلسفی ڈیموقریطیس (Democritus) کے مطابق یہ مادی جواہر لاتعداد ہیں۔ جدید فلسفی لائبنیز (Liebnitze) کے نقطہ نظر کے مطابق لاتعداد جواہر ہیں جن کو وہ موناڈز (Monads) کا نام دیتا ہے۔ ان لاتعداد موناڈز سے کائنات بنی ہے۔

کثرتیت کے ماننے والوں نے کائنات کی ابتدا دو سے زیادہ جواہر جو لاتعداد بھی ہو سکتے ہیں، بتائی ہے۔ پھر ان لاتعداد جواہر میں لحہ بہ لحہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے یہ خودکار نظام کے تحت کام کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی مظاہراتی صورت نظر نہ بھی آئے۔ پھر بھی کائنات میں تعمیر کا عمل

جاری رہتا ہے۔

مکاتبِ فکر: تصوریت / مثالیت اور مادیت

Schools of Thought: Idealism and Materialism

حقیقت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب فلسفہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معمولی ذرے سے لے کر پہاڑ جنگل، دریا، بادل غرضیکہ پوری کائنات کی حقیقت اور صداقت جاننے کے لئے مختلف ادوار میں فلسفیوں نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر بیان کئے ہیں۔ جن کی روشنی میں انسان حقائق کا ادراک حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کے بارے میں نظریات سامنے آتے رہے ہیں۔ ان کی بنا پر مختلف مکاتب فکر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ان مکاتب فکر کی مدد سے جانا جاسکتا ہے کہ کیا یہ کائنات بامعنی ہے؟ یا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیا کائنات ابتدا ہی سے موجود ہے؟ یا کسی تبدیلی کی بنا پر بعد میں وجود میں آئی ہے۔ زمان ومکان ذہن، مادہ، روح، کیا ہیں؟ ان کا آپس میں تعلق کیا ہے! ایسے بے شمار فلسفیانہ سوالات کے جواب نظریات حقیقت میں تلاش کئے جاسکتے ہیں، ان متعدد نظریات میں سے ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ذیل میں صرف دو کی وضاحت کی جاتی ہے۔

1۔ تصوریت / مثالیت (Idealism)

2۔ مادیت (Materialism)

1۔ تصوریت / مثالیت Idealism: زندگی اور کائنات کی حقیقت جاننے کے لئے تصوریت یا مثالیت ایک ایسا مکتبہ فکر ہے جس میں تصور اور خیال کے ذریعے حقیقت کی تلاش کی جاتی ہے۔ تصوریت کو مثالیت پسندی بھی کہا جاتا ہے۔ تصوریت کے نظریہ کے ماننے والوں کے خیال میں حقیقت بنیادی طور پر ذہن، تصور یا خیال ہے۔ جبکہ مادہ اس کا عکس ہے۔ مشہور یونانی فلسفی افلاطون کو تصوریت یا مثالیت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس کی فکر میں عقل، تصور، ذہن، امثال، عرفان اور منطق کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ تمام مادی اشیا غیر حقیقی ہیں کیونکہ وہ ہر وقت تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ جبکہ تصورات (Ideas) ہی حقیقی، مستقل اور ناقابل تغیر ہیں۔

مثلاً اشیا مادی ہوتی ہیں جو ختم ہو جاتی ہیں اور بعد میں نئی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ کسی شے کا تصور ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تصورات حقیقی ہوتے ہیں۔ جبکہ مادی اشیا تصورات کی محض نقل یا پرتو ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر جب ہم کہتے ہیں میرے پاس فلسفہ کی کتاب ہے، انگریزی اردو یا ریاضی کی کتاب ہے تو اس طرح ہم مخصوص کتابوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ یعنی فلسفہ کی وہ کتاب جو کاغذ کی بنی ہوئی میرے پاس موجود ہے۔ لیکن اگر ہم کہتے ہیں کہ "کتاب ایک مفید شے ہے"۔ تو ہم عمومی طور پر کتاب کے تصور یا خیال کی بات کر رہے ہیں۔ فلسفے، انگریزی اردو یا ریاضی کی کتاب مادی شکل کی ہے۔ لیکن کتاب کے بارے میں تصور یا خیال غیر مادی ہے۔ کتاب ختم ہوسکتی ہے دوبارہ تیار ہوسکتی ہے۔ جبکہ کتاب کا تصور ہمیشہ رہتا ہے، ختم نہیں ہوتا۔

افلاطون نے عالم مادی سے ماورا عالم امثال کا ذکر کیا ہے کہ اس کائنات سے الگ تصورات یا امثال کی ایک دنیا آباد ہے۔ وہاں سے تصور یا نظریہ آتا ہے تو دنیا کی کوئی شے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے کہ تصورات کی دنیا عالم مادی سے برتر و اعلیٰ اور ماورا ہے۔

تصوریت کے مطابق دنیا میں ذہن اور روحانی اقدار کی حیثیت اساسی اور بنیادی ہے۔

پروفیسر اے آر لیسی (A.R.Lacey) کی مرتب کردہ ڈکشنری آف فلاسفی میں تصوریت (Idealism) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ تصوریت سے مراد ایک خیال یا خیالات ہیں جن کی بناء پر حقیقت کی اصلیت ذہنی ہے۔ تصوریت بنیادی طور پر مادیت کی ضد ہے۔ تصوریت کی حقیقت یہ ہے کہ کائنات روحانی ہے جس کے وجود کا انحصار خدا پر ہے۔ اس نظریے کی رو سے حقیقت صرف ذہنی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر برکلے (Berkeley) کے خیال میں مادی اشیا صرف تصورات کی صورت میں انسان کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔ اسے ذہنی فعالیت کہا جاسکتا ہے۔

صحیح طور پر تصوریت پسندی جدید فلسفی کانٹ (Kant) کے بعد ہیگل (Hegel) کے فلسفہ کے نتیجے کے طور پر یورپ میں 1865ء سے 1925ء میں زیادہ مشہور ہوئی۔ ہیگل (Hegel) کے فلسفیانہ نظریات میں تصوریت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس نے دعویٰ (Thesis)، ردِ دعویٰ (Anti Thesis) اور ترکیب (Synthesis) کی ایسی مثلث بیان کی تھی جس سے فلسفہ جدید نے ایک نیا موڑ اختیار کیا تھا۔ ہیگل کا خیال ہے کہ کائنات میں ہونے والی تمام تبدیلیاں اور مظہریت صرف اور صرف ذہن، تصور یا خیال کی بنا پر ہوتی ہیں۔ دنیا میں معاشرتی، سیاسی، تمدنی، سماجی اور دیگر تمام تر نشو ونما و تبدیلی تصوریت کی وجہ سے ہوتی ہے۔

جارج برکلے کی مشہور زمانہ کتاب ''انسانی علم کے اصول''

"The Principles of Human Knowledge" 1710ء میں شائع ہوئی تھی جس میں برکلے نے موضوعی تصوریت / مثالیت کے بارے میں اپنے فلسفیانہ افکار درج کیے۔

تصوریت کو درج ذیل دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ موضوعی تصوریت / مثالیت (Subjective Idealism)

۲۔ معروضی تصوریت / مثالیت (Objective Idealism)

1:۔ موضوعی تصوریت Subjective Idealism:

موضوعی تصوریت سے مراد یہ ہے کہ ذہن میں موجود نظریات ہی حقیقت ہیں، خصوصاً انسانی ذہن میں موجود نظریات۔ موضوعی تصوریت کے بارے میں برکلے (Berkeley) نے غیر مادیت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

موضوعی تصوریت کے ماننے والوں کے خیال کے مطابق مادی اشیا کی الگ حیثیت یا وجود نہیں ہے بلکہ یہ اشیا محض ذہن کی قوت مدرکہ کی وجہ سے ہیں۔ برکلے موضوعی تصوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس کے خیال میں ذہنی اور تصوراتی دنیا ہی حقیقی دنیا ہے۔ برکلے کے نقطہ نظر کے مطابق جزوی اور کلی الفاظ کی عملی صورت میں اشیا موجود ہوتی ہیں۔

لاک (Locke) کے خیال میں اشیا کی صفات ابتدائی اور پھر ثانوی نوعیت کی ہوتی ہیں لیکن برکلے کے نقطہ نظر کے مطابق ابتدائی اور ثانوی دونوں صفات کی اہم اور لازمی حیثیت ضرور ہے۔ اس کے خیال میں کائنات کا تصور ذہنی اور خیالی صورت رکھتا ہے۔ اسی لیے موضوعی تصوریت کی صحیح عکاسی برکلے کے تصورات میں ملتی ہے۔

2۔ معروضی تصوریت Objective Idealism: معروضی تصوریت سے مراد ایسی مطلق تصوریت ہے جو انسانی ذہن کے باہر کی دنیا سے متعلق ہے۔ معروضی تصوریت کے مطابق صرف اذہان ہی حقیقت ہیں۔ گویا جو کچھ نظر آرہا ہے یا جو کچھ مادی اشیاء سے متعلق ہے اور انسانی ذہن میں موجود تصورات، خیالات اور امثال ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔

ہیگل (Hegel) معروضی تصوریت کا علمبردار ہے اس کے خیال کے مطابق کائنات کی حقیقت، اصلیت اور ماہیت صرف اور صرف فکر ہے۔ لیکن ہیگل ذہن اور مادہ کی ثنویت کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ اس کے خیال میں دونوں ایک ہی نامیاتی کل کے دو پہلو ہیں۔

معروضی تصوریت میں خیال، ذہن اور تصور کی عملی یا حقیقی صورت معروضی اشیا ہیں۔ مثلاً دیوار، پتھر، درخت، زمین، ثقافت اور دیگر تمام اشیا کی اشکال فکر ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔

ہیگل کے نقطہ نظر کے مطابق خدا ہی ایک تصور مطلق ہے۔ اس تصور مطلق یا کلی تصور کی مظہریت کائنات میں موجود قدرتی مظاہر میں نظر آتی ہے۔

2- مادیت (Materialism) مادیت کے نقطہ نظر کے مطابق اشیاء کی علیحدہ خود مکتفی حیثیت ہے۔ نظریات، تصورات یا خیالات کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ مادیت پسندوں کے خیال میں ہم التباس اور وہم کی وجہ سے اشیا کا صحیح ادراک نہیں کرتے جیسی کہ وہ حقیقتاً ہیں۔ کسی کے ذہن میں کوئی تصور یا خیال پیدا ہو یا نہ ہو جو اشیا دنیا میں موجود ہیں ان کی قائم بالذات حیثیت ہے۔ ہم اشیا کو دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ محسوس کریں یا نہ کریں۔ ان کے بارے میں سوچیں یا نہ سوچیں، وہ اپنی تمام تر خوبیوں اور حیثیتوں کے مطابق موجود ہیں۔ فرض کریں کسی علاقے یا زمانے میں کوئی شخص بھی موجود نہ ہو تو کیا یہ بڑے بڑے پہاڑ، جنگل، دریا، زمین، چاند ستارے، سورج اور دیگر اشیا غائب ہو جائیں گی، ہرگز نہیں۔

اسی لیے مادیت پسند سائنسی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ یعنی ہر شے کو فکری انداز سے لیتے ہیں۔ H_2O یعنی ہائیڈروجن دو حصے اور آکسیجن ایک حصہ پر خاص انداز سے عمل کیا جائے تو پانی کی شکل اختیار کر جائے گا۔ پوری کائنات میں ہر روز کسی نہ کسی عمل کی وجہ سے اشیا بنتی ہیں۔ کیمیائی تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی نوعیت اور ہیئت بدلتی رہتی ہے۔ لیکن ان کی کوئی نہ کوئی حیثیت ضرور رہتی ہے۔ اس لیے مادہ ہی اصل ہے۔ ذہن، تصور یا خیال اس سے پیدا ہوتا ہے۔

پروفیسر اے۔ آر لیسی نے ڈکشنری آف فلاسفی میں مادیت سے مراد یہ لکھا ہے کہ ہر شے ایک مخصوص انداز میں مادہ سے بنی ہوئی ہے۔ صرف مادہ ہی موجود ہے اور ذہن، روح وغیرہ محض التباس ہیں۔

کسی شے کے بارے میں ذہن کی عینیت کا نظریہ (The Identity Theory of Mind) عمومی طور پر مادیت کہلاتا ہے۔

مادیت پسند مفکرین مجردات کی حقیقت سے بھی انکار کرتے ہیں۔ وہ اشیا کی اصلیت اور حقیقت کو ہی اصلی مانتے ہیں۔ مادیت پسندوں کے نزدیک تصور یا ذہن بیشک اپنی حیثیت رکھتا ہے لیکن تصور کا انحصار مادہ پر ہے۔ مادہ ہے تو اس کا تصور ہے۔ پتھر موجود نہیں تو اس کا تصور نہیں ہوسکتا، انڈا، پانی، برف کوئی بھی شے جو موجود ہو گی تو اس کا تصور ذہن میں آتا ہے۔

غذا اور مشروب کی مادی حیثیت ہے۔ مادیت پسندوں کے خیال میں مادہ اوّل ہے اور خیال ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈبلیو۔ ٹی۔ سٹیس

(W.T Stace) کے خیال میں انسان بنیادی اور پیدائشی طور پر مادیت پسند ہے۔ پیدائش کے بعد بچہ مادی اشیا کا ادراک کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ سوچ بچار پختہ ہونے پر تصورات اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوتے ہیں۔

لسانی مسائل کا آج کل فلسفہ جدید اور پسِ جدیدیت میں بڑا چرچا ہے۔تمام تر لسانی تصورات یعنی الفاظ و فقرات سے مل کر بننے والے تصورات کی وجہ بھی بنیادی طور پر مادی اشیا ہیں۔ دنیا میں قدرتی اور فطری انداز میں اشیا نظر آتی ہیں تو ہم ان کے بارے میں اپنا اظہار خیال کرتے ہیں، سوچتے ہیں، نثر لکھتے ہیں، نظمیں اور غزلیں کہتے ہیں، تصورات سوچتے ہیں، تراکیب پیدا کرتے ہیں؛ یہ سب اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ مادی دنیا موجود ہو۔اگر ایک لمحے کے لئے ذہن میں یہ تصور میں لائیں کہ کوئی بھی مادی شے موجود نہیں ہے تو پھر ذہنی یا تصوراتی یا خیال کی دنیا ہوگی بھی یا نہیں ہوگی اگر ہوگی تو کیسی ہوگی؟

یونانی فلسفی ڈیموقریطس (Democritus) کے نظریہ جوہریت کے مطابق یہ کائنات مادی ہے اور عناصر (Elements) سے مل کر بنی ہے یا قائم ہے۔اسی لئے ڈیموقریطس کو مکتبہ فکر مادیت کا بانی مانا جاتا ہے۔

مشقی سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1:۔ مابعدالطبیعیات سے کیا مراد ہے؟

2:۔ وجودیات میں دراصل کائنات کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔اس تصور کی وضاحت کریں۔

3:۔ فلسفہ کے مکتبہ فکر تصوریت کی حقیقت بیان کریں۔

4:۔ مادیت پسندوں کے نقطہ نظر کے مطابق اشیا کی کیا حیثیت ہے؟

5:۔ تصوریت اور مادیت کا موازنہ کریں۔

6:۔ تصوریت کی دو اہم اقسام کا تفصیلاً جائزہ لیں۔

معروضی طرز (Objective Type)

سوال 1:۔ درج ذیل فقرات میں مناسب اور ضروری اصطلاحات یا الفاظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

1:۔ فلسفہ احدیت کے مطابق کائنات کی ابتداء کسی ایک .... سے ہوتی ہے۔

2:- لچسٹی کے مطابق ایک پراسرار غیبی قوت .... کا سب بنتی ہے۔

3:۔ یونانی فلسفی تھیلز (Thales) کا خیال تھا کہ کائنات کی ابتدا .... سے ہوئی ہے۔

4:۔ احدیث کی تین صورتیں غیبیت، فطریت اور .... بتائی گئی ہیں۔

5:۔ فلسفہ ثنویت کے مطابق کائنات کی ابتدا .... عناصر سے ہوئی۔

6:- ایمپیڈوکلیز (Empedocles) کے مطابق کائنات کی تشکیل .... بنیادی عناصر سے ہوئی ہے۔

7:۔ تصوریت کی پہلی قسم ....تصوریت ہے۔

8:۔ تصوریت کی دوسری قسم............تصوریت ہے۔

9:۔ دعویٰ، ردّ دعویٰ اور ترکیب کی مثلث .... نے بیان کی۔

10:۔ مادیت پسندی کے خیال میں ہم التباس اور............ کی وجہ سے اشیا کا صحیح ادراک نہیں کرتے۔

11:۔ غذا اور مشروبات کی حیثیت .... ہے۔

12:۔ ڈبلیو۔ ٹی۔ سٹیس کے مطابق انسان بنیادی طور پر............ پسند ہے۔

13:۔ جدید فلسفی ہیگل معروضی تصوریت کا............ ہے۔

14:۔ برکلے کے خیال میں مادہ ذہن میں صرف .... کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔

15:۔ افلاطون کا خیال تھا کہ تمام مادی اشیا............ ہیں۔

سوال 2:۔ ذیل میں سوالات کے ممکنہ دیئے گئے جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

1:۔ لفظ Meta کے لفظی معنی ہیں۔

1۔ ماورا 2۔ پہلے 3۔ درمیان 4۔ بعد

2:۔ طبیعیات کا علم ہمیں حقائق بتاتا ہے۔

1۔ مادی 2۔ خلائی 3۔ آسمانی 4۔ وقتی

3:۔ احدیت کے ماننے والوں کے خیال میں کائنات کس سے بنی ہے؟

1۔ ایک جوہر سے 2۔ مٹی اور پانی سے 3۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن سے 4۔ ہوا اور آگ سے

4:۔ ثنویت کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ کائنات بنی ہے۔

1۔ دو جواہر سے 2۔ نو جواہر سے 3۔ بغیر جواہر کے 4۔ خود بخود

5:۔ کثرتیت کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ کائنات بننے کی وجہ ہے۔

1۔ لاتعداد جواہر 2۔ ایک جوہر 3۔ بغیر علت 4۔ سوچ بچار

6:۔ مکتبہ فکر تصوریت میں بنیادی طور پر حقیقت ہے۔

1۔ مادہ 2۔ خلا 3۔ خیال 4۔ اشیا کی اہلیت

7:۔ مکتبہ فکر مادیت کے خیال میں حقیقت میں سب کچھ کی بنیاد ہے۔

1۔ مادہ 2۔ تصور 3۔ امثال 4۔ افکار

8:۔ عالم امثال کا ذکر کس فلسفی نے کیا ہے؟

1۔ ارسطو 2۔ افلاطون 3۔ الکندی 4۔ ڈیوی

9:۔ معروضی تصورات کا علمبردار ہے۔

1۔ہیگل 2۔اقبال 3۔جیمز 4۔الغزالی

10:۔ مکتبہ فکر مادیت کا بانی ہے۔

1۔ارسطو 2۔ڈیموقرائطس 3۔الفارابی 4۔کانٹ

سوال3: کالم"الف" اور کالم"ب" میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم"ج" میں درج کریں۔

کالم"الف"	کالم"ب"	کالم"ج"
☆ مابعد الطبیعیات کے معنی ہیں	کائنات دو جواہر سے بنی ہے	
☆ لفظ Meta کے معنی ہیں	کائنات لاتحداد جواہر سے بنی ہے۔	
☆ احدیت کے مطابق	ثنویت کا قائل تھا۔	
☆ ثنویت کے مطابق	اشیا کی پنہاں حقیقت ہے۔	
☆ کثریت کے مطابق	بعد۔	
☆ ڈیکارٹ	کائنات ایک جوہر سے بنی ہے۔	
☆ تصوریت میں	کائنات مادی جواہر سے بنی ہے	
☆ مادیت میں	فلسفہ جدید اور پسِ جدیدیت کا بڑا چرچا ہے۔	
☆ ڈیموقریطیس کے خیال میں	اشیا مادی صورت میں قائم بالذات ہیں۔	
☆ لسانی مسائل کا	اصل حقیقت خیال یا نظریہ کو ہے۔	

باب 6

اخلاقیات (Ethics)

فرد اپنے خاندان اور معاشرے میں انفرادی حیثیت کا مالک ہوتا ہے اور اجتماعیت کا حصہ ہوتا ہے۔ جب وہ ذہنی، شعوری، علمی اور فکری نشوونما کے مراحل طے کرتا ہے تو بعض اصول وضوابط اپنے اوپر لاگو کرتا ہے۔ دوسرں سے اپنا حق مانگتا ہے اور فرائض وذمہ داریاں ادا کرتا ہے۔ اس طرح حقوق وفرائض اور معاشرتی زندگی میں زمانے، ماحول، قوم، ضرورت اور حالات کے مطابق کوئی نہ کوئی معیار اپنانا پڑتا ہے۔ یہ معیار اسے انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ جو کام بھی بار بار کرتا ہے وہ پہلے عادت بنتی ہے اور پھر یہ عادت کردار کا حصہ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ ایسی عادات رسم ورواج کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ رسم ورواج اپنانے کے لئے انسان اتنا پختہ اور پرعزم ہو جاتا ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتا ہے۔ انہی رسم ورواج کو اخلاقیات کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ جو عادات پختہ ہو جاتی ہیں، انسان ان سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا۔ رفتہ رفتہ وہ اخلاقی اصول کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

اخلاقیات ایک معیاری علم ہے۔ اخلاقی معیار کے تحت اقدار قائم کی جاتی ہیں یا حالات کے مطابق قائم ہو جاتی ہیں۔ ان اخلاقی اقدار کا انسانی زندگی پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ انسان اخلاقی اقدار سے ہمیشہ قابو میں رہتا ہے یعنی جبلتوں کو کنٹرول کرنے کے لئے اخلاقیات سے مدد لی جاتی ہے۔ وہ اخلاقیات کے اصول یعنی اخلاقی اقدار خود بناتا ہے۔ اس کے لیے تجربہ، مشاہدہ، تاریخ، ثقافت، تہذیب وتمدن، مذہب، تعلیم، روایات، معاشریات، معاشیات، سیاسیات غرضیکہ انسانی زندگی سے متعلقہ جملہ علوم سے مدد لی جاتی ہے۔ جس طرح کے حالات وواقعات ہوں ویسی ہی اخلاقی اقدار بنتی ہیں۔ زمانہ، علاقہ اور قوم کی مناسبت سے اخلاقی اقدار بدلتی رہتی ہیں۔

سماجی، ثقافتی، گروہی اور مثالی طرز زندگی کے لیے منفی قوتوں سے چھٹکارہ اور مثبت اقدار کی پاسداری اخلاقیات سے ہوتی ہے۔ اخلاقی مثبت اقدار وہ بنیادی حقائق ہیں جن کی بنا پر مثالی کردار ادا کر کے معاشرے کو مثالی بنایا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حالات وواقعات، نئی ضرورتوں اور جدید تقاضوں کے مطابق معاشرے کی تنظیم نو کی جائے تا کہ معاشرہ نئے انداز سے استوار اور تعمیر ہو سکے۔ نئی اخلاقیات متعارف کرائی جائے تا کہ اس کی مدد سے معاشرتی ترقی ہو سکے۔ اخلاقی نظریات کو عمومی طور پر دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ انفرادی اخلاقیات اور اجتماعی اخلاقیات گرین (Green) کے خیال میں ''اخلاقی فرض وہی ہے جو انسان خود اپنے اوپر لاگو کرتا ہے'' جبکہ ہیگل (Hegel) کا کہنا ہے کہ ''انسان کو کیا کرنا چاہیے یا نیک بننے کے لئے کون سے فرائض انجام دینے چاہئیں، اس سوال کا جواب فلسفۂ اخلاق میں دینا آسان ہے۔ اسے صرف وہی کام کرنے چاہئیں جنہیں ان کے قائم شدہ تعلقات پیش کرتے اور تسلیم کرتے ہیں۔'' اخلاقیات ہمیں نیکوکار بننے میں مدد دیتی ہے۔ اس معیاری علم میں انسان کے کردار کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

اخلاقیات کے معنی اور دائرہ کار (Meaning and Scope of Ethics)

ذاتی سوچ بچار اور معاشرتی رویوں کی وجہ سے انسان اپنے عمل کو ایک خاص پیمانے سے ماپتا ہے۔ یہ پیمانہ یا معیار خود بخود انسان ہر دور میں نئے انداز سے طے کرتا ہے۔ وہ اپنے من میں بھی ایک معیار قائم کرتا ہے اور باہر کی دنیا بھی اسے طے شدہ معیار پر پرکھتی ہے۔ اس کی بنیاد پر اسے اچھا یا بُرا کہا جاتا ہے۔ معیار عمل کا مطالعہ اخلاقیات کرتی ہے۔ صحیح کیا ہے؟ غلط کیا ہے؟ کسی شخص کا کوئی عمل صائب ہے یا غیر صائب، مناسب ہے یا غیر مناسب، صحیح ہے یا غلط، اچھا ہے یا برا، اس کا فیصلہ کرنا علم الاخلاق یعنی اخلاقیات (Ethics) کا کام ہے۔

انگریزی زبان کا لفظ (Ethics) یونانی زبان کے لفظ (Ethos) سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی عوائد و رسوم کے ہیں۔ اسی طرح لاطینی زبان کا لفظ Moral جو Moras سے نکلا ہے کا مطلب بھی رسم و رواج ہے۔

اخلاقیات انسان کے لئے معاشرے میں رہنے کے لئے معیار طے کرتا ہے۔ اس معیار کے اصولوں پر ہم کسی کے عمل کو پرکھتے اور ماپتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اگر کوئی نوجوان اپنے ماں باپ کا احترام کرتا ہے۔ اساتذہ کی تعظیم کرتا ہے۔ اپنا کام محنت اور لگن سے کرتا ہے۔ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی تگ و دو کرتا ہے۔ کسی کو پریشان یا تنگ نہیں کرتا تو اسے اچھا اور بہتر نوجوان کہا جاتا ہے۔ ہر کوئی اس کی تعریف کرتا ہے۔ وہ سب کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے۔ سب اس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن اس کے برعکس اگر کوئی نوجوان عزت و احترام کے بجائے بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔ اپنا کام بھی نہیں کرتا، محنت سے جی چراتا ہے۔ لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ کرتا ہے، اپنی قابلیتوں، صلاحیتوں اور اہلیتوں کو زنگ آلود کر لیتا ہے تو ہر کوئی اس سے دور بھاگتا ہے۔ اس سے نفرت کرتا ہے۔ لوگ اس کو دیکھ کر نا خوش ہوتے ہیں۔ والدین بھی اس کے اس رویے سے پریشان ہوتے ہیں۔ پہلے نوجوان کا عمل اچھا ہے دوسرے کا برا۔ انہیں ماپنے کے لیے معاشرے میں موجود ایک پیمانہ یا معیار مقرر ہوتا ہے۔ جس سے اس کے کردار کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔

کسی شخص کے اچھے اور برے، صحیح اور غلط دونوں طرح کے اعمال و افعال کا مطالعہ اخلاقیات میں کیا جاتا ہے۔ گویا اخلاقیات صرف مثبت صحیح اور اچھے اعمال کا مطالعہ ہی نہیں کرتی بلکہ اس کا کام عمل کے منفی غلط اور برے پہلو کا مطالعہ کرنا بھی ہے۔

پروفیسر جان ڈیوی (John Dewey) کے خیال میں "اخلاقیات وہ معیاری علم ہے جو انسان کے کردار پر خیر و شر یا صواب و خطا کے نقطہ نظر سے بحث کرتا ہے۔" اخلاقیات معاشرے میں پھیلے ہوئے غیر مربوط اور غیر مسلسل کلیات و معلومات کو اکٹھا کر کے ایک سلسلے میں منسلک کرتا ہے۔ ان سے اصول وضع کر کے معیار اخلاق (Moral Ideal) قائم کیا جاتا ہے۔ پروفیسر راجرس (Prof. Rogers) نے اپنی کتاب "تاریخ اخلاقیات" میں لکھا ہے کہ "جو علم ایسے اصول بتاتا ہے جن سے انسانی کردار کے صحیح مقاصد کی حقیقی اور سچی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے اس کا نام علم الاخلاق ہے۔" اسی طرح پروفیسر للی (Prof. Lillie) کا خیال ہے کہ "اخلاقیات انسانی کردار کی معیاری سائنس (Normative Science) ہے اور کردار کا مطالعہ خیر و شر یا صواب و خطا کی حیثیت سے کرتی ہے۔"

علم نفسیات ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی شخصیت کے دو اہم پہلو ہیں ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ اسی طرح علم الاخلاق کے مطابق انسانی کردار کا اندرونی پہلو نیات پر منحصر ہوتا ہے اور انسانی کردار کا بیرونی حصہ اعمال پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض شخصیات اپنی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے ظاہری و خارجی کردار کو بنا سنوار کر رکھتی ہیں۔ لیکن اخلاقیات میں کسی فرد کے افعال کے اچھے اور برے دونوں پہلو دیکھے جاتے ہیں۔

شخصیت کا خارجی پہلو بظاہر کسی شخص کو زبردست اور عظیم دکھا رہا ہے تو ہوسکتا ہے وہ اندرونی طور پر ایسا نہ ہو۔ اس لیے اخلاقیات میں کردار کو نیت کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے اور نیت کسی کو دھوکہ نہیں دیتی۔ ایک یا دو معاملات میں اگر پتہ نہیں چلنے دیا جاتا تو پھر تیسرے چوتھے یا کسی اور وقت یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ مذکورہ شخص ظاہر اور باطن میں مختلف ہے۔ اگر کوئی شخص نیکی کرتا ہے تو نیکوکار ہے، وہ ہمیشہ نیکی بھلائی اور خیر کا ہی سوچے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی پروگرام کے تحت زیادہ عرصہ نیکی کرے اور پروگرام کے تحت دانستہ نیکی کی بجائے بدی کی طرف راغب ہو۔ وہ ایسا کر کے کلی طور پر نیکوکار نہیں کہلا سکتا۔ افلاطون (Plato) نے اپنی کتاب ''ریاست'' میں انفرادی اور اجتماعی معاشرتی زندگی کو اخلاقی لحاظ سے مثالی بنانے کے لئے چار بڑے فضائل کا ذکر کیا ہے۔ انہیں اُمہاتِ فضائل کہا جاتا ہے۔ افلاطون کے بیان کردہ چار فضائل حکمت، شجاعت، عفت یا ضبطِ نفس اور عدالت ہیں۔ ان پر عمل کر کے یقیناً اخلاقی پہلو کو زیادہ مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔ نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر بھی ان فضائل کی بہت اہمیت ہے۔ حکمت ایک خداداد عطیہ ہے۔ جس فرد یا جماعت میں قابلیتوں پر مشتمل حکمت و دانائی ہوگی وہ کامیاب ہوگی۔ انفرادی ذات اور قومی اداروں میں عدالت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ضبطِ نفس سے قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ شجاعت یعنی بہادری کسی قوم کی شان ہوتی ہے۔ انفرادی طور پر بھی ہر کام کرنے کے لئے جرأت و کوشش ہی شجاعت کہلاتی ہے۔

اخلاقیات کی اہمیت:

ہر علم کی اپنی نوعیت اور خاصیت کے لحاظ سے خصوصی اہمیت ہوتی ہے۔ اخلاقیات ایک معیاری علم ہے۔ اس کی اہمیت بے حد مسلمہ ہے۔ اخلاقیات کی اہمیت کو ہی اس کا دائرہ کار یا وسعت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یوں تو اخلاقیات کا تعلق انسان کی زندگی کے ہر پہلو سے ہے اور اہمیت کے لحاظ سے اخلاقیات کی وسعت بے کراں ہے لیکن ان میں چند ایک درج ذیل موضوعات کا خاص طور پر جائزہ لیا جاتا ہے۔

1۔ تعلیم و تربیت 2۔ کردار کی بہتری و پختگی 3۔ انفرادی تنظیم 4۔ اجتماعی بھلائی 5۔ حوصلہ مندی

6۔ مستقل مزاجی 7۔ تعمیرِ نو 8۔ ثقافتی پہلو 9۔ تہذیب و تمدن 10۔ اچھائی و برائی کی پہچان

1۔ تعلیم و تربیت: اخلاقیات بچوں، بڑوں اور ضرورت کے تحت ہر طبقہ فکر کی تعلیم و تربیت کرنے میں سود مند ثابت ہوتی ہے۔ گھر میں خاندان کا ہر فرد دانستہ یا غیر دانستہ طور پر پیدائش ہی سے بچوں کی اخلاقی تربیت کرتا ہے۔ جس طرح ماں باپ اور بہن بھائی زندگی گزارتے ہیں بچے ان کی اسی طرح نقالی کرتے ہیں۔ اگر کوئی ماں یا باپ جھوٹ بولتا ہے تو بچے اس کو صحیح عمل سمجھ کر اسی طرح جھوٹ بولیں گے اور اگر ماں یا باپ سچ بولتا ہے اور جھوٹ سے نفرت کرتا ہے تو بچے بھی یقیناً ایسا ہی کریں گے۔ اخلاقیات ہی بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کرنے میں مدد دیتی ہے۔

خاندان کے بعد معاشرتی اخلاقیات سیکھی جاتی ہے۔ اداروں، دفتروں اور دکانوں وغیرہ میں بھی اخلاقی اقدار و اخلاقی قوانین سے ملازمین و افراد کی تربیت کی جاتی ہے۔

ہر ادارے کے اپنے اصول و ضوابط ہوتے ہیں وہی اصول و ضوابط ان کی اخلاقی اقدار ہوتی ہیں۔ اخلاقیات کی وسعت یا دائرہ کار کی پہلی سیڑھی یہی ہے کہ بچوں اور متعلقہ افراد کی صحیح سمت میں تعلیم و تربیت کی جائے۔

2۔ کردار کی بہتری و پختگی: اخلاقیات کی مدد سے افراد کے کردار میں بہتری و پختگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ کردار میں خوشگوار اور مناسب تبدیلی ابتدائی عمر سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہونے سے کردار کی بہتری اور پختگی ممکن ہے۔ بچوں اور بچیوں کے کردار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے اخلاقی اقدار ہی اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

3۔ انفرادی تنظیم: اخلاقیات کی وسعت اور دائرہ کار میں فرد کی انفرادی لحاظ سے شخصیت میں تنظیم پیدا کی جاتی ہے۔ اخلاقی اقدار انفرادیت کو اتنا منظم اور مضبوط بنا دیتی ہیں کہ وہ دوسروں کے لیے مشعل راہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا انفرادی تنظیم صرف اور صرف اخلاقی اقدار ہی سے ممکن ہوتی ہیں۔ معاشرے میں رہتے ہوئے انسان معاشرتی اقدار اپناتا ہے لیکن ان معاشرتی اقدار کی بنیاد بھی اخلاقی اقدار ہی مہیا کرتی ہیں۔

4۔ اجتماعی بھلائی: اخلاقیات ہمیں سکھاتی ہے کہ انفرادی کے بعد اجتماعی تنظیم اور بھلائی اخلاقی اصول و ضوابط سے ممکن ہوتی ہے۔ اخلاقیات کی مدد سے ہی اجتماعی شعور (Collective Consciousness) کو اجاگر کیا جا سکتا ہے اگر کسی قوم میں اجتماعی شعور اجاگر ہو جائے تو وہ دنیا کی بہترین اور طاقتور قوم بن سکتی ہے۔ اخلاقیات انفرادیت کی تشکیل کے ساتھ ساتھ اجتماعی بھلائی کا بیڑہ بھی اٹھاتی ہے۔

5۔ حوصلہ مندی: بلند اخلاقی معیار کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنانے والے باہمت اور حوصلہ مند ہوتے ہیں۔ اس حوصلہ مندی سے وہ کردار کی مزید بہتری اور بھلائی کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔

اس طرح افراد، قوم اور اداروں کو حوصلہ ملتا ہے۔ ہمت بڑھتی ہے اور اپنے ہونے کا صحیح احساس ہوتا ہے۔

6۔ مستقل مزاجی: اخلاقیات سے لوگ مستقل مزاج بنتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ آج آپ کسی ایک قوم کے قوانین اپنائیں اور کل کسی دوسری قوم کے۔ بلکہ مثبت اخلاقی اقدار اپنا کر ہی مستقل مزاجی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ مستقل مزاج شخصیت ہی مثالی اور اعلیٰ و برتر درجہ پر پہنچتی ہے۔

اخلاقی اقدار کے حوالے سے مستقل مزاجی سے مراد ہے کہ اخلاقی قوانین پر ہر لحہ کاربند رہا جائے۔ عبادات کی اہمیت و برکت اپنی جگہ لیکن انسان کا کردار اس وقت صحیح، صائب مناسب اور متوازن ہوتا ہے۔ جب وہ مستقل مزاجی سے اخلاقی اقدار کو اپنائے۔ اگر کوئی اخلاقیات کی تعلیم حاصل کر لے اور اسے اپنا لے تو وہ معاشرے کے لیے اچھا انسان اور اچھا شہری بن سکتا ہے۔

7۔ تعمیر نو: معاشرے کی تعمیر اور پھر تعمیرِ نو سے مراد یہ نہیں ہے کہ نئی عمارات اور سڑکیں بنائی جائیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے انفرادی اور اجتماعی طور پر بہتری پیدا کی جائے اور یہ بہتری اخلاقی اقدار اپنانے سے ہوتی ہے۔ نئی اخلاقی اقدار متعارف کرانے اور اُن پر عمل کرنے سے معاشرے کی تعمیر نو ہوتی ہے۔ تعمیرِ نو اذہان کو بدلنے سے ممکن ہوتی ہے۔ اس لیے اخلاقیات ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ جب معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہو جائے، کسی قسم کا بگاڑ پیدا ہو جائے تو اس کو اخلاقیات کے اصول و ضوابط کے سہارے تخریبی قوتوں کو روک کر تعمیری فکر کی طرف گامزن کیا جا سکتا ہے۔ اخلاقیات کے دائرہ کار اور وسعت میں تعمیرِ نو ایک اہم حیثیت کا حامل تبدیلی کا عمل ہے۔

8۔ ثقافتی پہلو: اخلاقیات سے ہمیں اپنی ثقافتی حدود میں وسعت اور بہتری پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ بدیسی ثقافت کی یلغار سے بچنے

کے لیے ضروری ہے کہ اپنی اخلاقی اقدار کو مضبوط کیا جائے تا کہ اپنی ثقافت زیادہ طاقت ور، فعال اور زیادہ خوبیوں والی بنائی جائے۔ اخلاقیات میں ثقافتی پہلو یہ ہے کہ کسی بھی ملک یا قوم میں علاقائی اور تاریخی لحاظ سے لوگوں کی نفسیاتی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ کھیل، ڈرامے، گانے، میلے، نمائشیں، پیداواری ادارے اور اپنی مٹی سے بنیادی لگاؤ کو اجاگر کرنا اخلاقی تقاضا ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھا جائے کہ قومی تاریخ، روایات، بنیادی تعلیم اور مذہب پر ٹھیس نہ آئے۔

9۔ تہذیب وتمدن: تہذیب وتمدن بھی ثقافت کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اخلاقیات کا یہ تقاضا ہے کہ تہذیب وتمدن کے اندر رہ کر لوگوں کو بہتر زندگی گزارنے کی سہولتیں میسر آنی چاہئیں۔

جس قوم کی تہذیب وتمدن میں عدل وانصاف، ایمانداری، مساوات اور رواداری ہوگی وہ اخلاقی لحاظ سے زیادہ بہتر اور عظیم قوم ہوگی۔ اپنی تہذیبی وتمدنی خوبیوں کو اپنانا اور منفی رویوں سے چھٹکارہ حاصل کرنا بھی اخلاقی ضرورت ہے۔ اس لیے اخلاقیات کے زمرے میں یہ بات سب سے اہم ہے کہ قوموں کو تہذیبوں کے ٹکراؤ سے بچانے کیلئے بین الاقوامی اخلاقیات پر عمل کیا جائے۔ بین الاقوامی اخلاقیات سے مراد یہ ہے کہ پوری دنیا کی تمام تر قوموں میں مشترک تہذیبی اور تمدنی اقدار کا جائزہ لیا جائے اور ان مثبت اور مشترک اقدار کو سب کے لیے عام کیا جائے۔

10۔ اچھائی وبرائی کی پہچان:۔ اخلاقیات کی اہمیت، وسعت اور دائرہ کار کا اہم فریضہ یا موضوع یہ ہے کہ عوام الناس کی اس طرح تعلیم وتربیت کی جائے کہ وہ اچھائی اور برائی کی پہچان کر سکیں۔ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ اچھائی اور برائی کی حقیقت اور اصلیت جاننے کے لیے اخلاقیات سے استفادہ کیا جائے۔ برائیوں سے اجتناب اور اچھائیوں کو اپنانا انسان کی بہتری اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ رذائل سے نفرت اور فضائل سے محبت ہمیں اخلاقیات سکھاتی ہے۔ اخلاقیات کا کام انسان کے اچھے اور برے دونوں افعال کا جائزہ لینا ہے۔ جھوٹ بولنا، قتل کرنا، دھوکہ دینا، جیسی منفی اقدار سے دور رہا جائے جبکہ محبت، خلوص، انس اور بھائی چارے جیسے فضائل کو اپنایا جائے تا کہ انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے لوگ مستقل اخلاقی اقدار اپنا کر اپنی اور دوسروں کی خوشی میں اضافہ اور الم ورنج میں کمی کر سکیں۔

اخلاقی نظریات (Ethical theories)

اخلاقیات ایک معیاری علم ہے۔ جس سے انسان کے کردار کو ایک مخصوص معیار کے مطابق جانچا جاتا ہے۔ یوں تو متعدد اخلاقی نظریات ہیں جن پر اخلاقیات کا دارومدار ہے۔ لوگ بالعموم انہی نظریات کی بنیاد پر اخلاقیات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک اخلاقی نظریات درج ذیل ہیں۔

1۔ سنہری وسط (Golden Mean)

2۔ افادیت (Utilitarianism)

3۔ ارادہ طیبہ (Good Will)

(1) سنہری وسط Golden Mean: درجے کے لحاظ سے کسی بھی اخلاقی عمل کی ابتدا ہوتی ہے اور انتہا بھی۔ مثلاً اگر ایک فعل کی

ابتدا بزدلی ہے تو اس کی انتہا اندھا دھند دلیری ہے۔ لیکن ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک ایسا مقام ہے جو افراط اور تفریط کا شکار نہیں ہوتا۔ بزدلی اور اندھا دھند دلیری کے درمیان شجاعت کا مقام ہے۔ یہ زیادہ مناسب اور صحیح عمل ہے بلکہ عملِ صالح ہے۔ جس سے مزید بھلائی اور خیر پھیلتی ہے۔ جبکہ بزدلی اور اندھا دھند دلیری سے خیر کی توقع نہیں کی جاتی۔ میانہ روی ہی درمیانی راستہ ہے جو کہ خیر ہے، اچھائی ہے، بھلائی ہے۔ نیکی یعنی فضیلت ہے۔

یونانی فلسفی ارسطو اسی نقطہ نظر کا قائل ہے۔ اس کے خیال میں میانہ روی یعنی درمیانی راستہ ہی اخلاقی طریق ہے اور اس درمیانی راستے کو وسط (Golden Mean) یعنی سنہری وسط کہا جاتا ہے۔ سنہری وسط بھی وہی ہے جس سے خیرِ اعلیٰ حاصل کیا جا سکے۔ نہ تو بزدلی سے خیرِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی اندھا دھند دلیری سے۔ معاشرتی حالات و واقعات، ضروریات، حاجات کی نوعیت کے مطابق سنہری وسط طے کیا جاتا ہے یا معلوم کیا جاتا ہے۔

یونانی فلسفی ارسطو کا کہنا ہے کہ عقل اور تجربے سے استفادہ کر کے سنہری وسط معلوم کیا جا سکتا ہے۔ عقل کا استعمال صرف فلسفی کر سکتے ہیں۔ اور تجربات و مشاہدات سے عام لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے حکمت و دانائی سے اصولوں پر زندگیاں گزارنے والے عظیم انسانوں کی صحبت اور حیاتِ طیبہ پر عمل پیرا ہو کر اپنے آپ کو سنہری وسط کے راستے پر ڈالا جا سکتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ انسان کو عظیم سے عظیم تر بنا دیتا ہے۔ پاکباز اور عظیم شخصیات کی زندگی فضیلت کا درجہ رکھتی ہے اس لئے ان کی پیروی اور تقلید کرنا ہی کامیاب زندگی گزارنا ہے۔ دراصل یہی اخلاقی طریق کار ہے۔

ارسطو کے خیال میں حکمت و دانائی کا مالک عالمگیر اخلاق کا منبع ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے اصولوں پر عمل پیرا ہونا ہی سنہری وسط کو پانا اور اخلاقی برتری حاصل کرنا ہے۔ یہی انسان کی زندگی کا معیار ہے۔

(2)۔افادیت Utilitarianism: انسان کوئی بھی کام کرتا ہے تو اس میں اس کا اپنا یا کسی دوسرے کا فائدہ ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ یہاں فائدہ سے مراد معاشی فائدہ ہی نہیں بلکہ اخلاقیات میں ذہنی آسودگی اور خوشگواری بھی انسان کے طے شدہ معیار یا نصب العین کو پورا کرتی ہے۔ نظریہ افادیت کے ماننے والے یعنی افادئین کا نقطہ نظر ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے اہم مقصد اور صحیح نصب العین خوشی، لذت اطمینان حاصل کرنا اور رنج والم سے چھٹکارا پانا ہے۔ ہمیں ایسے افعال سرانجام دینے چاہئیں جن سے زیادہ لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ لذت حاصل ہو۔ بزرگوں اور صالحین کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی طرزِ حیات کو بہتر بنایا جا سکتا ہے جس سے زیادہ سے زیادہ لذت یا افادیت حاصل ہوتی ہے۔

نظریہ افادیت کے مطابق ہر حالت میں لذت و سکون پانا اور دکھوں، تکالیف اور مشکلات سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ کسی دوسرے کی تکلیف اور رنج والم میں کمی کر کے بھی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح بھی بھلائی اور فلاح و بہبود کے کام کرنے سے انسان اپنی خوشی اور لذت میں اطمینان قلب پاتا ہے۔ مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے اچھا، مناسب اور صحیح کام کیا ہے اور یہ کام یا عمل معیاری زندگی کے اصولوں اور نصب العین کے مطابق ہوتا ہے۔ نظریہ افادیت کے مطابق زیادہ فائدہ حاصل کرنا اہم امر ہے۔

نظریہ افادیت (Utilitarianism) اور نظریہ لذتیت (Hedonism) کا اگر اکٹھا جائزہ لیا جائے تو نتیجہ حصولِ لذت اور رنج والم

میں کمی ہوتا ہے۔ دونوں میں جذبات واحساسات کی تشفی ہوتی ہے۔ ماہرینِ اخلاقیات کے مطابق جذبات واحساسات کی تشفی، اور اطمینانِ قلب اپنی اور دوسروں کی زندگیوں کو سہل بنانے سے حاصل ہونی چاہیے۔ اگر زندگی کا یہی مقصد بن جائے تو صالح اعمال سرزد ہوں گے۔ لیکن اگر تشفی اور اطمینان قلب نہ ہو تو غیر صالح اعمال ادا ہوتے ہیں۔

انسانی شخصیت کا نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ احساس یا تو خوشگوار ہوتا ہے یا ناخوشگوار۔ صالح اعمال سے خوشگواری اور غیر صالح اعمال سے ناخوشگواری کے احساسات جنم لیتے ہیں۔ لذت انگیز اعمال نیکی پیدا کرتے ہیں اور الم ورنج انگیز اعمال بدی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افادیت کتنی مقدار میں حاصل کی جائے۔ اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

1۔ ذاتی ضرورت اور عقل کے مطابق لذت یا افادیت کا حصول

2۔ ضرورت سے زیادہ لذت یا افادیت کا حصول

3۔ زیادہ سے زیادہ لذت یا افادیت کا حصول

افادیت میں درجے اور نوعیت کا بڑا عمل دخل ہے۔ مثلاً اگر کوئی ایک عمل کرنے سے فائدہ، لذت یا خوشی حاصل ہوتی ہے تو ہوسکتا ہے وہ کام بار بار کرنے سے اس کی اہمیت کم ہوجائے اور اس طرح فائدہ لذت یا خوشی کا درجہ اور نوعیت بھی کم ہوجائے یا ختم ہوجائے۔ لیکن اس کے باوجود بعض افعال ایسے ضرور ہیں جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے مستقل نوعیت کے ہیں۔ یعنی ایسے افعال کرنے سے کبھی لذت یا خوشی میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ مثلاً عبادت کرنا، آرام کرنا، طے شدہ وقت کے مطابق حقوق حاصل کرنے کی تگ ودو کرنا اور فرائض ادا کرنا، لیکن ان اعمال میں بھی کثرت اور تکرار کی زیادتی افادیت کو کم کردیتی ہے۔

افادیت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کو معیاری زندگی گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی نصب العین طے کرنا پڑتا ہے۔ اخلاقی معیار کا سب سے اہم نظریہ افادیت ہے جس کا براہ راست تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔ انسانی اخلاق افادی اصول حیات سے مزین ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی عمل ہو ہر ایک میں کسی نہ کسی نوعیت کا فائدہ ہی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ علمِ معاشیات، سیاسیات، نفسیات، اخلاقیات، مذہب غرضیکہ تمام علوم مادی، تصوری، ذہنی اور احساس خوشگواری پیدا کرنے کے لئے اصول وضوابط طے کرتے ہیں۔

افادیت حاصل کرنے کے درج ذیل مختلف طریقے اپنائے جاسکتے ہیں۔

1۔ اپنی عقل وخرد سے افادی اصول وضع کئے جائیں اور لذت حاصل کی جائے۔

2۔ آباؤ اجداد کی محنت اور تجربے سے افادی اصول حاصل کئے جائیں۔

3۔ ذاتی تجربے، حالات وواقعات اور تقاضوں کے مطابق فائدہ، لذت یا تشفی پائی جائے۔

4۔ دیگر اداروں، مذہب، علوم، ثقافت، تاریخ، معاشرہ اور معیاری نصب العین کے مطابق افادی اصول بنائے جائیں۔

کانٹ، سجوک، مل، بینتھم، بریڈلے، اور دیگر ماہرینِ اخلاق کے اخلاقی نظریات الگ الگ ہیں لیکن ان سب کا کلی اور مشترک نتیجہ یہ ہے کہ انسان اعمال صالح کرے کیونکہ اس سے بھلائی پھیلتی ہے اور انسان کو اطمینانِ قلب اور تشفی حاصل ہوتی ہے۔ برے اور ناپسندیدہ اعمال سے بچا جائے کہ ان سے ناخوشگواری اور پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے۔

صرف معیاری نصب العین، معیاری اخلاق سے ممکن ہوتا ہے۔ جبکہ معیاری اخلاق کا مطمع نظر بھی رنج والم میں کمی اور خوشی میں اضافہ ہے۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف نظریہ افادیت پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

(3)۔ارادہ طیبہ (Good Will): فلسفی کانٹ (Kant) کا نقطہ نظر ہے کہ انسان کی نیت یعنی ارادہ اس کے اعمال کی بنیاد بنتا ہے۔ بیرونی عوامل، غایات، حالات اور واقعات کا اعمال کے بہتر اور برے ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف اور صرف ارادہ طیبہ ہی خیر ہے اور کوئی شے یا عمل خیر اعلیٰ نہیں ہے۔ خیر اعلیٰ (Highest Good) صرف نیک ارادہ یعنی نیتِ طیبہ یا ارادہ طیبہ ہے۔ ارادہ طیبہ سے مراد عملی طور پر یہ ہے کہ فرض کو فرض سمجھ کر ادا کرنا چاہیے۔ فرض کی ادائیگی اس لئے نہیں کرنی چاہئے کہ کوئی پوچھنے والا ہے یا فرض ادا کرنے سے خوشی، مسرت یا کمال حاصل ہوتا ہے۔ فرض کو کسی وجہ یا مقصد کے تحت ادا کرنے سے اس کی حقیقی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کسی مقصد یا غایت کی حیثیت سے فرض ادا کیا جائے تو اس طرح اخلاقی قانون اضافی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے فرض اپنی صحیح حیثیت کھو جاتا ہے۔

کانٹ کے نظریہ کے مطابق قوانین کی دو اقسام ہوتی ہیں ایک مفروضی اور دوسری اطلاقی۔ مفروضی قوانین غیر متعین اور اضافی ہوتے ہیں۔ جبکہ اطلاقی قوانین غیر مقید اور عالمگیر ہوتے ہیں۔ معاشی قوانین طے شدہ اور غیر متیقن اور اضافی ہوتے ہیں یہی مفروضی قوانین ہوتے ہیں۔ جبکہ اطلاقی قوانین غیر مشروط ہوتے ہیں جبکہ اخلاقیات کے قوانین کو فرض کی حیثیت سے ادا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق ارادے یا نیت سے ہے اور ایک صحیح اور حقیقی فرائض ادا کرنے والا شخص کوئی وجہ، غایت یا مقصد کو مدِ نظر نہیں رکھتا بلکہ اس کو ادا کرنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ اور جو اطلاقی قوانین پر عمل کرتا ہے اپنے اندر ارادہ خیر یعنی ارادۂ طیبہ (Good Will) رکھتا ہے۔ کانٹ کے نزدیک فرض کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے فرض کو بغیر کسی مزید حکم یا فرمان کے ادا کرنا چاہئے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (Encyclopedia Britanica) میں ارادۂ طیبہ (Good Will) کا مفہوم معاشی اور کاروباری ساکھ کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کاروباری ساکھ کے لئے انسان ہمیشہ تگ و دو کرتا ہے تا کہ وہ معاشی ترقی حاصل کر سکے اس طرح وہ کامیاب کاروباری انسان کہلائے گا اور سودمند کاروبار کرے گا۔ لیکن اخلاقیات میں ارادۂ خیر یا ارادہ طیبہ یا نیک ارادہ سے مراد وہ نیت ہے جس کی بنا پر انسان افعال ادا کرتا ہے۔ بیرونی یا معروضی حالات و واقعات اور عوامل سے بے نیاز اندرونی نیت سے کوئی کام کیا جائے تو وہ کام خیر اعلیٰ کے زمرے میں آئے گا۔ انسان اپنی نیت کو خود ہی بہتر طور پر جانتا ہے۔ دوسرے اس کے افعال سے اس کی نیّت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو خیرات اس خیال سے دے کہ وہ شخص اس کے کام آئے گا تو خیرات دینے کی نیکی کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ لیکن اگر خیرات فرض یا بھلائی اور خیر کے لئے دی جائے تو پھر یہ عمل نیکی اور خیر اعلیٰ کے زمرے میں آتا ہے۔

کانٹ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے کہ توقعات اور خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر اعمال کئے جائیں تو ان کی بنیاد ارادہ طیبہ بنتی ہے۔ اس طرح کئے ہوئے اعمال نیکی کے درجے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

راشڈل (Rashdil) اور دیگر ماہرین اخلاقیات نے کانٹ کے نظریہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کانٹ کا نظریہ زیادہ طاقتور اور حقیقت کے قریب ہے۔

اخلاقیات کا مقصد عوام الناس کی اصلاح اور بہبود ہے۔فلسفیانہ انداز میں اخلاقیات انسانی زندگی کے اچھے اور برے دونوں انداز کے مطالعہ کا نام ہے۔اس لئے اخلاقی اصول وضع کرنے کے لیے انسانی فکرونظر کو اگر مذہبی بنیادوں پر استوار کیا جائے تو اسے مذہبی نظریہ اخلاق کہیں گے۔اسی طرح اگر یہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ہو تو اس اخلاقی نظام کو اسلامی نظریہ اخلاق کہا جائے گا۔اسلامی نظریہ اخلاق میں لوگوں کی اصلاح اور بہبود اللہ کے احکام کے مطابق کی جاتی ہے۔

اسلام انسانوں کی رشد و ہدایت اور بھلائی کا مذہب ہے۔قرآن مجید میں متعدد بار اخلاقی تعلیمات کا ذکر کیا گیا ہے۔اخلاقیات میں لوگوں کے اعمال کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔صائب ہیں یا غیر صائب۔

اسلامی نظریہ اخلاق بھی یہی ہے کہ لوگوں کو صحیح راستہ اپنانے کی تلقین کی جائے اور غلط سے ممانعت کا درس دیا جائے اور برائی سے اجتناب برتنے کا کہا جائے۔

حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے کہ:۔

ترجمہ:۔"میں تو مکارم اخلاق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔"

حضور پاکؐ تمام عمر عملی طور پر اعلیٰ اخلاق کا نمونہ پیش کرتے رہے۔آپؐ کے قول و فعل میں ہمیشہ مطابقت رہی۔انسانیت کی بھلائی اور فلاح و بہبود کا درس دیا اور خود بھی اس پر عمل پیرا رہے۔ہمیشہ لوگوں سے خوشگوار انداز میں پیش آتے رہے۔

اسلامی نظریۂ اخلاق میں فضائل کی تلقین کی گئی ہے اور رذائل کی نفی۔ اسلامی حوالے سے عفوودرگزر ایک بہت اہم فضیلت ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ آلِ عمران میں ارشاد ہے کہ:

ترجمہ:۔"اور دبا لیتے ہیں غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو۔"

اس آیت مبارک میں منفی ہیجانی حالت غصہ کو قابو کرنے کی تلقین کی گئی ہے جبکہ خطاؤں کو معاف کر دینے کا درس دیا گیا ہے۔

اسلامی نظریہ اخلاق کو درج ذیل احادیث مبارک کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ترجمہ:۔ "تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے۔جس کے اخلاق اچھے ہوں۔" (بخاری)

ترجمہ:۔ "اللہ کے بندوں میں اللہ کو سب سے عزیز وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔" (طبرانی)

ترجمہ:۔ "مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔" (ترمذی،ابوداؤد)

درج بالا احادیث میں اخلاقی نظام پر زور دیا گیا ہے۔اگر کوئی شخص عبادت کرتا ہے لیکن دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا۔اخلاقی اصول نہیں اپناتا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو اس عبادت نے کیا سبق دیا ہے۔لوگوں سے اخلاقی طور پر اچھا برتاؤ کرنا ہی اسلامی تعلیمات کا خاصا ہے۔اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو پھر وہ شخص اسلامی اخلاقی تعلیمات سے دوری اور ان کو مسترد کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔کیونکہ اسلام میں عملی طور پر نیکی اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

اسلام میں ہر لحہ نیکوکار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔غریب،بے کس نادار اور ضرورت مند کی مدد کرنا اہم فرض بتایا گیا ہے یہی انسان کے

لئے اخلاقیات کی تعلیم ہے کہ غریب، بے کس، کمزور اور زیردست کی ہر حالت میں مدد کی جائے۔ مہذب اور شائستہ انداز اپنایا جائے۔ امن وسلامتی اور صلح وصفائی کی بات کی جائے۔

ماں باپ، بہن بھائی، ہمسائے، مسافر، اولاد اور ملازمین غرضیکہ ہر شخص کی عزت واحترام کیا جائے۔ بچوں، بوڑھوں اور ضرورت مندوں کی مدد کی جائے۔ حضور پاکؐ کا ارشاد ہے۔

ترجمہ: مسلمانوں سے انکساری وسادگی سے پیش آئیں۔ بے شک سادہ زندگی گزارنا ایمان ہے (ابوداؤد)۔

خدا کی عبادت کرنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔ نماز پڑھنے پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ العنکبوت میں ارشاد خداوندی ہے "بے شک" نماز روکتی ہے۔ بے حیائی اور بری بات سے"

اسلامی نظریہ اخلاق میں رحم کرنے کی بارہا تلقین کی گئی ہے۔ حدیث مبارک ہے کہ:۔

ترجمہ:۔ "اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔" (مسلم ترمذی)

گویا لوگوں پر رحم کرنا اسلامی نظریہ اخلاق کا اہم جزو ہے۔

اس طرح حدیث مبارک ہے کہ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔"

ارشاد خداوندی ہے۔

ترجمہ:۔ "بے شک آپ خلق عظیم کے مالک ہیں۔"

اسلامی نظریہ اخلاق میں انفرادی اور اجتماعی دونوں انداز سے مسلمانوں کو اخلاقی تعلیمات اپنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مساوات، رواداری، بھائی چارہ، عدل وانصاف، ایفائے عہد، ایمانداری، امانت داری، حقوق العباد اور دیگر فضائل کو اپنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اسی طرح منفی رویوں اور عادات وخصائص اور رذائل کو رد کیا گیا ہے۔

مسلم فلسفیوں میں ابن مسکویہ نے سب سے پہلے فلسفہ اخلاق پر ایک مستقل، مفید اور کارآمد کتاب "تہذیب الاخلاق" لکھی۔ ابن مسکویہ کا کہنا ہے کہ صرف چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو فطری طور پر نیک ہوتے ہیں اور کبھی بدی کرنے کا نہیں سوچتے۔ تعلیم وتربیت سے پورے معاشرے کو اخلاقی اصول عملی طور پر سکھائے جاسکتے ہیں۔

مشہور مسلم مفکر وصوفی امام الغزالیؒ کے نزدیک بنیادی اخلاق، غضب اور شہوت میں عدل واعتدال کا نام حسن اخلاق ہے۔ ان قوتوں میں اعتدال صرف تعلیم وتربیت سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔

اخلاق بنیادی طور پر انسانی زندگی کے عملی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ مذہب بھی انسان کو بہتر اور صحیح زندگی گزارنے کے لیے اعمالِ صالح کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام میں انفرادی اور اجتماعی معاشرتی ماحول کو بہتر بنانے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔ ان ہدایات اور اصول وضوابط پر عمل کر کے انسان اپنی دنیوی اور اخروی زندگی کو بہتر کرسکتا ہے۔ اسلام میں حیات بعد از موت کا تصور پایا جاتا ہے۔ اسی لیے اخلاقی اعمال پر عمل کرنے سے منزلِ مقصود یعنی حیات بعد از موت کا سامان پیدا کرنا ہے۔ اسلامی نظریۂ اخلاق میں کامیاب زندگی گزارنے کے سنہری اصول پنہاں ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر یقیناً آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ تعلیم کا اہم مقصد مثالی معاشرہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ اسلامی نظریۂ اخلاق

بھی مثالی معاشرہ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اسلامی نظریۂ اخلاق کا اہم پہلو یہ ہے کہ مقاصد نیک ہونے کے ساتھ ساتھ نیک مقاصد حاصل کرنے کے ذرائع بھی صالح ہونے چاہئیں کیونکہ اگر ابتدا اور بنیاد صحیح اور مثبت ہوگی تو حاصل کردہ نتائج بھی یقیناً صحیح اور مثبت ہی ہوں گے۔

اسلام اخلاقِ عامہ کا پرچار کرتا ہے۔ کسی خاص فرد، گروہ یا قوم کے لیے اخلاقی اصول لاگو کرنے کی بجائے سب کو اخلاقی عادات اور اخلاقی قوانین پر عمل کرنے کی ہدایات دیتا ہے۔

مشقی سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1:۔ اخلاقیات کی تعریف بیان کریں؟

2:۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے اخلاقیات کی اہمیت بیان کریں

3:۔ اخلاقی نظریات کیونکر ضروری ہیں؟ سنہری وسط کے حوالے سے وضاحت کریں۔

4:۔ صحیح عمل کرنے سے افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وضاحت کریں؟

5:۔ ارادۂ طیبہ ہی اعلیٰ ترین خیر ہے۔ وضاحت کریں۔

6:۔ اسلامی نظریہ اخلاق کیا ہے؟

معروضی طرز (Objective Type)

سوال 1:۔ درج ذیل فقرات میں مناسب اور ضروری اصطلاحات یا الفاظ سے خالی جگہ پر کیجئے۔

1:۔ جبلتوں کو کنٹرول کرنے کے لیے.......... سے مدد لی جاتی ہے۔

2:۔ اخلاقی مثبت اقدار وہ بنیادی حقائق ہیں جن کی بنیاد پر.......... معاشرہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

3:۔ انگریزی زبان کا لفظ Ethics.......... زبان کا لفظ Ethos سے مشتق ہے۔

4:۔ کس شخص کے اچھے اور بُرے اعمال و افعال کا مطالعہ.......... میں کیا جاتا ہے۔

5:۔ علم الاخلاق کے مطابق انسانی کردار کا اندرونی پہلو.......... پر منحصر ہوتا ہے۔

6:۔ یونانی فلسفی ارسطو درمیانی راستہ کا قائل ہے جسے.......... وسط بھی کہا جاتا ہے۔

7:۔ کانٹ کے نظریے کے مطابق قوانین کی.......... اقسام ہوتی ہے۔

8:۔ مسلم فلسفی ابنِ سکویہ نے سب سے پہلے فلسفہ اخلاق پر ایک کارآمد کتاب.......... لکھی۔

9:۔ چند اخلاقی نظریات میں سے تین سنہری، افادیت اور.......... ہیں۔

10:۔ انسانی زندگی کا سب سے اہم مقصد خوشی لذت اور اطمینان حاصل کرنا ہے۔ یہ نظریہ.......... کا نقطہ نظر ہے۔

سوال 2: کالم ''الف'' اور کالم ''ب'' میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم ''ج'' میں درج کریں۔

کالم ''الف''	کالم ''ب''	کالم ''ج''
☆ معیارِ عمل کا مطالعہ	تاریخ اخلاقیات ہے۔	
☆ انگریزی کا لفظ Ethics	فضائل بیان کئے ہیں۔	
☆ راجرس کی کتاب کا نام	اخلاقی فرض خود لاگو کیا جاتا ہے۔	
☆ اخلاقیات انسانی کردار کی	اخلاقیات کرتی ہے۔	
☆ افلاطون کے چار	یونانی لفظ Etho سے نکلا ہے۔	
☆ گرین کے خیال میں	معیاری سائنس ہے۔	
☆ اخلاقیات میں انسانی	میانہ روی کا راستہ ہے۔	
☆ سنہری وسط	زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے لذت ہے۔	
☆ افادیت میں	نیک ارادے کی وجہ سے ہے۔	
☆ اعلیٰ ترین خیر صرف	زندگی کا ثقافتی پہلو بھی جانچا جاتا ہے۔	

اسلامی اقدار (Islamic Values)

اقدار کسی بھی فرد یا قوم کی شناخت ہوتی ہیں۔اقدار ہی کی بنا پر کوئی قوم بنتی یا بگڑتی ہے۔اقدار مثبت بھی ہوتی ہیں اور منفی بھی۔یعنی خیر اور شر کی وجہ سے اقدار کا تعین ہوتا ہے۔

باشعور ہونے پر انسان کو اپنی زندگی میں مختلف اقدار سے واسطہ پڑتا ہے۔اقدار ہی وہ وسیلہ اور ذریعہ ہیں جن کی بدولت انسان اپنی زندگی میں بہتری پیدا کرتا ہے۔ہر لمحہ کسی نہ کسی قدر کی بنا پر عملی زندگی گزارتا ہے۔وقت کی پابندی کرنا، دوسروں کا خیال رکھنا، محبت وخلوص سے پیش آنا، مہمانوں سے بہتر سلوک کرنا، کسی کی مدد کرنا، سب ایسی اقدار ہیں جن سے ہمیں ہر روز واسطہ پڑتا ہے۔

چونکہ مذہب بھی بہتر زندگی گزارنے کا ایک طریق ہے اس لئے ہر مذہب متعدد ایسی مشترکہ اقدار کا پابند ہوتا ہے جن کی بنا پر مختلف مذاہب میں باہم گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔تمام مذاہب انسانوں کی رہنمائی کے لئے ہیں اس لئے ان پیش کردہ اقدار کا مقصود و مطلوب بھی انسانی بھلائی اور بہتری ہے۔اسلام کی اقدار اس کی شناخت ہیں۔اسلامی اقدار کا منبع قرآن مجید، حدیث مبارکہ، اسوہ حسنہ اور خلفائے راشدین کی تعلیمات ہیں۔قرآن مجید ایک ایسی الہامی کتاب ہے جس کا موضوع انسانیت کی فلاح ہے۔انسان کی بھلائی کے بارے میں قدم قدم پر رُشد و ہدایت قرآن مجید سے حاصل ہوتی ہے۔ارشادِ خداوندی ہے کہ:

☆ لقدخلقنا الانسان فی احسن تقویم (سورۃ التین آیت نمبر4)

ترجمہ:۔ "ہم نے انسان کو بہتر صورت میں پیدا کیا ہے۔"

ایثار و قربانی، مساوات، رواداری، بھائی چارہ، عزت و تکریم، تقویٰ، مہمان نوازی، رحم کرنا، ہمسایوں سے سلوک، حقوق و فرائض، عدل و انصاف، ایفائے عہد، دیانت داری اور کسب رزق حلال، تمام وہ اسلامی اقدار ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر انسان احسن تقویم کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔جہاں اسلامی تعلیمات میں ان فضائل کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔وہاں رذائل سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔غیبت، چغلی، چوری، قتل، منافقت، گالی گلوچ، دھوکہ دہی، ناانصافی، حسد، تکبر، جھوٹ اور ظلم سب منفی اقدار ہیں۔اسلامی تعلیمات ان رزائل کو سختی سے مسترد کرتا ہے۔

اسلام کا تصورِ اللہ (Islamic Concept of Allah)

انسان جب مذہب کو مانتا ہے تو یہیں سے عابد اور معبود کا رشتہ شروع ہو جاتا ہے۔یعنی بندے اور خالق کا رشتہ۔بندہ اپنے خالق کو مانتا ہے اس کی عبادت کرتا ہے۔اس سے اپنی حاجات و خواہشات پوری کرنے کی التجا کرتا ہے۔کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جب وہ خالق ہے تو وہ پالنے والا بھی ہے۔وہ خیر و برکت کا منبع ہے۔تمام بھلائی اسی کی طرف سے ہے اور وہ لوگوں کو نیکی بھلائی اور بہتری کی طرف جانے کی تلقین اور تعلیم دیتا ہے۔کسی انسان کا خواہ کوئی بھی مذہب ہو وہ حقیقت مطلقہ کو ضرور مانتا ہے۔حقیقت مطلقہ یعنی خدا کو ماننا ہی مذہب کو اپنانا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ایک آفاقی مذہب ہے اسلام میں اللہ کا تصور بہت عظیم ہے۔جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے تو اس کا پہلا قدم ہی یہ ہے کہ وہ صرف ایک اللہ پر ایمان لاتا ہے کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔قرآن مجید کی سورۃ اخلاص میں اللہ کا ارشاد ہے۔

☆ قل هو الله احدo الله الصمدo لم يلد٥ ولم يولدo ولم يكن له كفوا احدo

ترجمہ:۔ کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ (ہے)، ایک ہے۔(وہ) معبود برحق جو بے نیاز ہے، نہ کسی کا باپ ہے۔اور نہ کسی کا بیٹا۔اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اس سورۃ کی آیات مبارکہ میں اللہ کا تصور بیان کیا گیا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح جنتا نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی سے جنا گیا ہے۔وہ ہر لحاظ سے یکتا ہے۔

اس سورۃ مبارکہ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اللہ دنیاوی صفات سے ماوراء ہے جن کو مکمل طور پر سمجھنا یا جاننا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اللہ اپنی مثال آپ ہے، اس جیسی کوئی دوسری مثال نہیں دی جاسکتی۔اللہ عظیم ہے۔کائنات اور کائنات سے ماوراء کوئی شے یا ہستی ایسی نہیں ہے جو اللہ جیسی ہو۔

☆ ليس كمثله شيءٌ (الشوریٰ آیت نمبر 11)

ترجمہ:۔ ''اس جیسی کوئی شے نہیں''

اللہ لاتعداد صفات کا مالک ہے۔اس کی صفات کی جھلک اس کے خاص بندوں میں نظر آتی ہے۔فطرت کے مظاہر بھی اس کی صفات کا پتہ دیتے ہیں۔لیکن اللہ بے مثال ہے وہ انسانوں کی طرح کی کوئی بھی صفت نہیں رکھتا۔

مسلمانوں کی ایک فکری تحریک معتزلہ تھی جس کے بانی واصل بن عطا تھے۔اس مکتبہ فکر کو معتزلہ کا نام ان کے مخالفین نے دیا تھا جبکہ وہ اپنے آپ کو اہل التوحید والعدل کہتے تھے۔معتزلہ تمام مذہبی عقائد کی عقلی توجیہہ اور تاویل کے قائل تھے۔انہوں نے عقل و منطق کی بنیاد پر مذہبی عقائد کی تفسیر لکھی۔ان کا خیال تھا کہ قرآن فہمی میں عقل اور منطق کا استعمال نہایت ضروری ہے۔معتزلہ نے اسلام میں تصور اللہ کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ اللہ ہر اعتبار سے ایک مکمل وحدت ہے جو کائنات کی ہر شے سے ماوراء ہے اسلام نے تصور اللہ میں شرک کے کسی بھی انداز کو جائز قرار نہیں دیا۔

اسی طرح مسلمانوں کی ایک اور فکری تحریک اشاعرہ تھی جس کے بانی ابوالحسنالاشعری تھے۔اشعری کے نقطہ نظر کے مطابق مذہبی عقائد کو محض عقل سے نہیں جانا جاسکتا۔بعض امور پر فقط ایمان لانا پڑتا ہے۔عقل محدود ہے۔مذہبی عقائد کو عقل نہیں جان سکتی۔اشاعرہ کے نقطۂ نظر کے مطابق اللہ بے نیاز ہے۔اس کی حکمتیں انسان کی سوچ اور عقل و فکر سے ماوراء ہیں۔اشاعرہ نے اسلام میں تصور اللہ کے حوالے سے اس عقیدے کا اظہار کیا کہ صفات باری تعالیٰ کا صحیح تعین انسانی سوچ اور فکر کے بس کی بات نہیں بلکہ اللہ پر ایمان لانا ہی اس کے ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔

اسلامی عقائد میں سب سے بنیادی اور اولین عقیدہ توحید ہے۔توحید کے لغوی معنی ہیں ایک ماننا، یکتا جاننا۔ہر علم کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں۔دین کی اصطلاح میں توحید سے مراد سب سے برتر واعلیٰ اور تمام کائنات کے خالق و مالک کو ایک ماننا اور اس پر ایمان لانا اور

عبادت کے لائق سمجھنا ہے۔

دنیا میں کوئی بھی شخص کسی شے کو دیکھتا ہے تو فوراً اس کا دھیان اس شے کے بنانے والے کی طرف جاتا ہے کوئی شے بغیر اس کے صانع کے ممکن نہیں ہے۔ پوری کائنات کا ایک خالق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے کہ۔

☆ افی اللہ شک فاطر السموت والارض ،(سورۃ ابراہیم، آیت نمبر10)

ترجمہ:۔ ''کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین۔'' پوری کائنات میں ایک خاص نظم وضبط پایا جاتا ہے۔ سورج کی گردش چاند اور ستارے خاص وقت کی رات اور خاص وقت کا دن کائنات کی ہر حرکت ہر شے میں اللہ کی قدرت کی ہی وجہ سے خاص نظم وضبط پایا جاتا ہے۔''

قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے:

☆ انا کل شیء خلقناہ بقدر ط (سورۃ القمر، آیت نمبر49)

ترجمہ:۔ ''ہم نے ہر چیز کو (ایک خاص) انداز سے پیدا کیا ہے۔''

☆ لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا الیل سابق النھار وکل فی فلک یسبحون

(سورۃ یٰسین ، آیت نمبر40)

ترجمہ:۔ ''نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں، اللہ خالق و مالک ہے۔ دن، رات، سورج اور زمین و آسمان کا نظم وضبط سب اللہ تعالیٰ کی حکمت وصنعت ہے۔ اُس نے پوری کائنات کو پیدا کیا ہے ہر شے کو مضبوط اور طاقتور بنایا ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ النمل میں ارشاد خداوندی ہے۔

☆ صنع اللہ الذی اتقن کل شیء (سورۃ النمل، آیت نمبر88)

ترجمہ:۔ ''کاریگری اللہ ہی کی ہے جس نے ہر شے کو مضبوط بنا رکھا ہے۔''

اسلام میں تصور اللہ اہم ترین عقیدہ ہے۔ وہ خالق ہے، کارساز ہے، عظیم ہے، رحیم ہے۔ اس لئے ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ کو ہی قادر مطلق سمجھ کر اس سے مدد مانگی جائے اس کے فیض وکرم سے اپنی مجبوریوں، پریشانیوں اور مشکلوں کا حل تلاش کرنا چاہئے۔ وہ معبود ہے اسی کی عبادت کی جائے کہ وہ عبادت کے لائق ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

☆ الاتعبدو آالآ ایاہ (سورۃ الاسرا، آیت نمبر23)

ترجمہ:۔ تم صرف اسی کی عبادت کیا کرو۔

☆ والھکم الہ واحد لاالہ الا ھو (سورۃ بقرہ، آیت نمبر163)

ترجمہ:۔ ''اور تمہارا معبود ایک خدا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

اللہ کے تصور کے بارے میں جاننے کے بعد یہ بات جاننا نہایت ضروری ہے کہ وہ لاتعداد خوبیوں وصفات کا مالک ہے ذیل میں

چند ایک صفات کی وضاحت کی جاتی ہے

واحد: اللہ تعالیٰ ایک ہے۔یعنی تعداد میں دو یا دو سے زیادہ اللہ نہیں ہیں۔ وہی معبود ہے اس کے علاوہ اگر کوئی اور بھی معبود ہوتا تو کائنات میں فساد پھیل جاتا۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

☆ **لو کان فیهما الهة الا الله لفسدتا** (سورۃ الانبیاء، آیت نمبر22)

ترجمہ:۔ ''اگر ان دونوں (یعنی زمین اور آسمان) میں علاوہ اللہ کے کوئی معبود ہوتا تو ان دونوں میں فساد برپا ہو جاتا۔''

اللہ کے ایک ہونے کی یہ صورت ہے کہ کوئی شے بھی پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے کہ وہ اللہ جیسی ہو قرآن مجید میں ارشاد ہے:

☆ **لیس کمثله شیی** (سورۃ الشوریٰ ،آیت نمبر11)

ترجمہ:۔ ''کوئی شے اس جیسی نہیں ہے۔''

کائنات میں موجود ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے۔مخلوق میں جو بھی صفت پائی جاتی ہے وہ اللہ ہی کی دی ہوئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ذاتی ہیں۔اس لیے دنیا کی کوئی بھی شے اس جیسی نہیں ہے۔

اللہ ہر اعتبار سے ایک اور واحد ہے۔ جو کائنات کی ہر شے سے برتر اور ماورا ہے۔ وہ نہ کسی کی وجہ سے ہے اور نہ ہی کسی کا محتاج ہے بلکہ وہ یکتا اور واحد اور تمام کائنات کا مالک ہے۔قرآن مجید میں سورۃ اخلاص میں اس کی وحدت کے تصور کو بیان کیا گیا ہے اس سورۃ کی روشنی میں اللہ کے تصور توحید کے تحت کوئی شخص یا شے اللہ کی برابری نہیں کر سکتی۔اس نے پوری کائنات کو بنایا ہے، پیدا کیا ہے بلکہ ہر شے اس کی محتاج ہے۔اس کا کوئی شریک و ہمسر نہیں ہے

خالق: اللہ تعالیٰ خالق ہے یعنی ہر شے کو اس نے تخلیق کیا ہے پوری کائنات اس کی تخلیق ہے۔ جب اللہ کسی بھی شے کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو لفظ ''کن'' کہتا ہے اور وہ شے پیدا ہو جاتی ہے۔اللہ ہر شے کا خالق ہے۔ پیدا کرنے والا ہے قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔

☆ **الا له الخلق والامر**. (سورۃ الاعراف، آیت نمبر5)

ترجمہ: ''جان لو کہ سب مخلوق بھی اس کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں، حیوانوں، آسمانوں اور زمین غرضیکہ پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔یعنی اس نے ایک معمولی ذرے سے لے کر پہاڑ تک سب کو پیدا کیا ہے۔قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے۔

☆ **ان ربکم الله الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام ثم استوی علی العرش.**

(سورۃ الاعراف، آیت نمبر54)

ترجمہ:۔ ''بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے۔جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر جا ٹھہرا۔''

قادر: اللہ تعالیٰ تمام اشیا پر قدرت رکھتا ہے۔ سب کچھ اس کے قابو میں ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ویسا ہی ہوتا ہے قرآنِ مجید میں خدا کا فرمان ہے۔

☆ اِن اللّٰہ علیٰ کل شیءٍ قدیر.   (سورۃ البقرہ، آیت نمبر20)

ترجمہ:۔   ''بے شک اللّٰہ ہر شے پر قادر ہے۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ اللّٰہ پوری کائنات کو سنبھالتا ہے۔قابو میں رکھتا، منظم کرتا ہے۔ترکیب و ترتیب دیتا ہے۔وہ کارساز ہے۔

عادل: اللّٰہ تعالیٰ انصاف پسند ہے وہ خود بھی عدل کرتا ہے۔اور اپنے بندوں کو بھی انصاف کرنے کی تلقین کرتا ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

☆ واذ حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل.   (سورۃ النسآء، آیت نمبر58)

ترجمہ:۔   ''اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو پھر انصاف کے ساتھ کرو۔'' اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو جزا دے گا اور برائی کرنے والوں کو سزا۔وہ اپنے بندوں کے درمیان انصاف کرتا ہے۔اسی لیے لوگ بھی اس کی اس صفت کی پیروی کرتے ہیں۔وہ کسی کا اجر ضائع نہیں کرتا۔قرآن مجید میں اللّٰہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

☆ فان اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین.   (سورۃ ھود، آیت نمبر115)

ترجمہ:۔   ''اللّٰہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔''

کامل: اللّٰہ تعالیٰ کامل ہے اس میں کل اور جزو کا تضاد نہیں ہے۔تصور اللّٰہ کے بارے میں مسلمان فلسفی الفارابی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اللّٰہ ایک ہے اس میں کوئی جزیات نہیں ہیں۔وہ دیگر اشیا کی طرح مختلف اجزا سے مل کر نہیں بنا۔اس لیے اس میں ذات وصفات کا تضاد نہیں ہے۔اللّٰہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔یہ نہیں ہے کہ اس میں ایسی صفات یا اجزا پائے جاتے ہیں جن میں تبدیلی آتی ہو۔وہ غیر متغیر ہے اور مستقل بالذات ہے۔

☆ لن تجد لسنۃ اللّٰہ تبدیلا (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر62)

ترجمہ:۔ ''تم خدا کی عادت میں تغیر و تبدل نہیں پاؤ گے۔''

نور: اللّٰہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔اس کا جسم نہیں ہے۔وہ انسانوں کی طرح کا نہیں ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

☆ اللّٰہ نور السموات والارض. (سورۃ النور، آیت نمبر35)

ترجمہ:۔ ''اللّٰہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

اللّٰہ جسم نہیں ہے۔قرآن مجید میں خدا کے ہاتھ یا دیگر اجزائے جسم کا ذکر صرف علامتی طور پر ہے۔حقیقی طور پر انسانوں کی طرح ہاتھ یا آنکھیں نہیں ہیں قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

☆ ید اللّٰہ فوق ایدیھم . (سورۃ الفتح ، آیت نمبر10)

ترجمہ:۔ ''خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔''

قرآن فہمی کے لیے عقل کا استعمال اور ایمان کی منزلوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔اللّٰہ مجسم نہیں ہے۔قرآن میں اللّٰہ کے ہاتھ چہرے اور آنکھوں کا ذکر انسانی اجزائے جسم کی طرح نہیں ہے۔

اللہ اور انسان کے درمیان تعلق (Relation Between Man and Allah)

اسلام میں اللہ کا تصور ایک اہم اور بنیادی عقیدہ ہے۔اس تصور اور عقیدہ ہی سے انسان اور اللہ کے درمیان خصوصی تعلق یا رشتہ قائم ہوتا ہے اور یہ رشتہ عابد اور معبود کا ہے۔انسان بندہ یعنی عابد ہے اور اللہ معبود ہے جس کی عبادت کی جاتی ہے۔اسلام میں اللہ اور انسان کے درمیان تعلق کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔اس تعلق ہی کی بنا پر انسان زمین پر اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔اللہ کی صفات کی جھلک انسان میں پائی جاتی ہے۔اللہ خود بھی بہترین صفات کا مالک ہے اس نے انسان کو بھی بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ارشادِ خداوندی ہے:

☆ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ٥ (سورۃ التین، آیت نمبر4)

ترجمہ:۔ اور ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر فضل کرتا ہے۔رحم کرتا ہے۔ہدایت دیتا ہے اور تلقین کرتا ہے۔کسی شخص کا راہ راست پر چلنا، بہتر زندگی گزارنا، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا، اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا اور لوگوں کے کام آنا، یہ سب اللہ کا فضل ہے۔وہی کسی کو ایسی طاقت عطا کرتا ہے جس کی بناء پر وہ دنیا میں مثبت اقدار کی پاسداری کرتا ہے۔قرآن مجید میں اللہ کا ارشاد ہے۔

☆ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء. (سورۃ الجمعہ، آیت نمبر4)

ترجمہ:۔ "یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے انسانوں ہی میں سے رسول بھیجے کیونکہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کرسکتا ہے۔اس طرح رسول بھی انسان اور بشر یعنی بندے ہی تھے۔اللہ کا پیغام فرشتوں کے ذریعے آتا رہا۔یہ پیغام اللہ کے رسول اپنی امت کو دیتے رہے۔رسالت اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور ایک عظیم عطیہ ہے جو اللہ اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے۔اس سے بھی اللہ کا انسان سے تعلق یا رشتہ کا پتہ چلتا ہے۔

اللہ لامحدود صفات کا مالک ہے۔اس کی وسعت اور بڑائی انسان کے سمجھنے کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ انسان محدود ہے اور اللہ لامحدود۔اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے جو بنیادی طور پر انسانوں ہی میں سے تھے۔وہ افضل واعلیٰ اور برتر صفات کے مالک تھے جو اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

☆ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم

ترجمہ:۔ "اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔"

(سورۃ النحل، آیت نمبر44)

اللہ اور انسان کا آپس میں تعلق کائنات میں موجود تمام مخلوقات سے تعلق ہے۔انسان سوچتا ہے، ذہن رکھتا ہے، اللہ پر ایمان لاتا ہے، اس کی عبادت کرتا ہے، اس لئے وہ اشرف المخلوقات ہے۔اللہ سے انسان کا تعلق اللہ کو ماننے سے شروع ہوتا ہے، اس کو ماننے والا اطمینانِ قلب، انکسار، وسعت نظر، پرہیزگاری، عزم و ہمت، شجاعت، استقامت، عزتِ نفس، عدل و انصاف، رحم اور پختہ ارادے کا مالک بن جاتا ہے۔

اسلام میں حقوق العباد، فرائض اور معاشرتی انصاف

Human Rights, Responsibilities and Social Justice in Islam

انسانی زندگی انتہائی کٹھن مراحل سے گزر کر اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے۔ زبردستوں اور زیردستوں کی اس دنیا میں کسی کو جینے کا حق ملنا حکمت خداوندی کا نتیجہ ہے۔ زندگی اللہ کا عطا کردہ عطیہ ہے۔ اس سے استفادہ کرنا اس کی نعمتوں کا اعتراف کرنے کے مترادف ہے۔

اسلام میں انسانی حقوق کا مفہوم واہمیت

Meaning and Importance of Human Rights in Islam

ارکانِ اسلام توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو ماننے اور پورا کرنے کو حقوق اللہ کہا جاتا ہے۔ جبکہ مخلوقات یعنی والدین، بچوں، ہمسایوں، مسافروں، وغیرہ کے لئے حقوق العباد ہیں۔

اسلام میں ہر جاندار کا احساس کرنا، مصیبت سے نجات دلانا، اپنا اور دوسروں کے آرام کا، خیال رکھنا، انسان، حیوانات حتیٰ کہ نباتات کو بھی تکلیف نہ دینا۔ حضور پاکؐ نے پھل دار درخت کو بلاوجہ کاٹنے سے منع کیا ہے۔ درخت لگانا اسلام میں کارِثواب سمجھا گیا ہے۔ حضور پاکؐ نے فرمایا جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے، جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے۔ (بخاری و مسلم)۔

اسلام میں دیگر انسانوں کے حقوق کے علاوہ خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے۔ حضور پاکؐ نے فرمایا۔

''بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔ تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔'' (صحیح بخاری)

اس حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان کا اپنے اوپر اتنا زیادہ حق ہے کہ وہ اعتدال اور میانہ روی سے کام لے۔ انسانی جسم کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس سے اعتدال کے مطابق کام لیا جائے۔ نہ زیادہ اور نہ بہت کم۔ ہاتھ، پاؤں، زبان آنکھ، کان غرضیکہ ہر عضو کو اتنا استعمال میں نہ لایا جائے کہ وہ ناکارہ ہو جائے اسلام میں انسانوں کے حقوق میں سب سے پہلے خود انسان کا اپنا حق ہے۔ پھر قریب ترین عزیز کا پھر پڑوسی و دیگر عوام الناس کی باری آتی ہے۔

اسلام میں حقوق کی یہ صورت حال ہے کہ اس سے انفرادی اور اجتماعی بھلائی پھیلتی ہے۔ یہی اسلام کا سب سے بڑا پیغام۔ کہ محبت، بھلائی، بھائی چارہ اور ہمدردی حقوق دینے سے پوری قوم میں پھیل جائے۔

حقوق جب حاصل ہوں تو انسان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے، اس کی حیثیت مستند ہوتی ہے، وہ معتبر اور قابل احترام بنتا ہے۔ کسی طالب علم کو اگر تعلیمی ادارے میں داخلہ لینے اور اس کی اشیاء استعمال کرنے کا حق ہے۔ تو اس کا فرض بھی بنتا ہے کہ وہ ان اشیا کو نہ توڑے۔ ان کی حفاظت کرے۔ اسی طرح اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے تو ان کا احترام کرنا۔ ان کا کہا ماننا طلبا و طالبات کا فرض بھی ہے۔

اسلام میں انسان کے حقوق و فرائض بڑی تفصیل اور گہرائی سے بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہ حقوق و فرائض ہیں جو اسلام نے لوگوں کو تفویض کیے ہیں۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ نے ان سنہری اصولوں پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ حقوق دینے اور فرائض ادا کرنے سکھائے ہیں۔ صحابہ کرامؓ، خلفائے راشدین اور دیگر اکابرین نے ان سنہری اصولوں پر عمل کر کے دیگر اقوام سے منفرد اور ممتاز حیثیت حاصل کی۔ یوں تو

ہر مذہب میں انسانوں کو حقوق دیئے گئے ہیں۔ لیکن اسلام نے اس دور میں یہ حقوق عطا کیے جب انسانی معاشرہ مکمل طور پر جہالت اور ظلمت کا شکار تھا۔

اسلام میں دیے گئے چند ایک عمومی حقوق درج ذیل ہیں:

زندگی کا حق: اسلام نے مسلمانوں کو آپس میں اور دیگر اقوام کے ساتھ صلح وصفائی اور بھلائی سے رہنے کی تلقین کی ہے۔ ہر ایک کو جینے کا حق ہے۔ اسلام دوسروں کی زندگی کا احترام کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ حضور پاکؐ نے ہمیشہ لوگوں کا احترام کیا اور مسلمانوں کو احترام کرنے کی ہدایت کی۔ جو کفار ان پر ظلم کرتے تھے، اُن سے بھی حسن سلوک سے پیش آئے۔ وہ عورت جو آپ کی راہ میں کانٹے بکھیرتی تھی اس سے بھی بھلائی سے پیش آئے۔ وہ طائف کی بستی جس کے باسیوں نے آپ کو لہولہان کر دیا تھا، ان کے لئے بھی دعائے خیر کی۔ اسلام ہر کسی کو احترام اور جینے کا حق دیتا ہے۔

حق ملکیت: اسلام نے لوگوں کو اپنی ذاتی اشیا رکھنے کا حق دیا ہے۔ گھر، لباس، اشیائے ضرورت اور دیگر سامانِ حیات کی ملکیت کا ہر کسی کو حق دیا ہے۔ بنیادی طور پر تو ہر شے کا مالک و خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن وہ اپنے بندوں کے فائدے اور سہولت کے لئے حق ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے۔

حق تعلیم: ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ مثلاً جنگ بدر میں قید کئے گئے کفار میں سے جو پڑھے لکھے تھے ان کو اس شرط پر آزادی دینے کا حکم فرمایا گیا کہ مسلمانوں کو تعلیم دیں۔ اس سے حق تعلیم کا اندازہ ہوتا ہے ۔قرآن مجید جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہونا شروع ہوا تو سب سے پہلی وحی یہ تھی۔

☆ اقرباسم ربک الذی خلقo (سورۃ العلق ، آیت نمبر1)

ترجمہ:۔ ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔''

حق آزادی: اسلام میں دیگر مذاہب سے بڑھ کر انسانوں کو آزادی کا حق دیا گیا ہے۔ اسلام سے قبل عرب میں غلام رکھنے کا رواج عام تھا۔ اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کی تعلیم دی۔ حضور پاکؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت بلالؓ حبشی تاریخ اسلام میں عظیم مؤذن قرار دیئے جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ ایک مقدمے میں تصریح کرتے ہیں۔ اسلام میں کسی شخص کو عدل کے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا۔ (موطا امام مالک)

اسلامی تعلیمات کے اثر سے مسلمان حکمران، صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین کی زندگی میں حق آزادی کی متعدد عملی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک دفعہ حضرت خبابؓ جو غلام تھے مگر بڑے درجہ کے صحابی تھے حضرت عمرؓ سے ملنے کے لئے آئے تو آپؓ نے ان کو عزت واحترم سے اپنے قریب بٹھایا اور فرمایا ایک شخص کے علاوہ کوئی دوسرا اس جگہ کا مستحق نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا وہ کون ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا بلالؓ۔ (مستدرک حاکم)

آزادی سے مراد زندہ رہنے، بولنے اور لکھنے کی آزادی ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق ہر طرح کی آزادی ہے لیکن اس میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ آزادی سے فائدہ حاصل کرنے والا اگر مسلمان ہے تو اپنی حدود سے باہر نہیں نکلے گا۔

حقوق العباد: اسلام میں عمومی حقوق کے ساتھ خصوصی حقوق پر بے حد زور دیا گیا ہے کہ انسان یہ خصوصی حقوق ہر حالت میں لازماً پورے کرے۔ حقوق العباد پورے کرنے سے انسانی زندگی سکون واطمینان سے گزرتی ہے۔ مساوات اور رواداری سے خوشگوار ماحول پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح حقوق اللہ یعنی عبادات کا پورا کرنا ضروری ہے اس طرح خصوصی حقوق یعنی حقوق العباد پورے کرنا بھی مسلمان ہونے کی نشانی ہے۔

حق سے مراد وہ ضرورت، حاجت اور اختیار ہے جو کسی کو کسی سے ملتا ہے مثلاً ہر کسی کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ اس سے مراد ہے کہ ہر کسی کو جینے کی ضرورت، حاجت اور اختیار اپنی ذات پر ہے اور یہی حق ہے۔ اس کو اس ضرورت، حاجت اور اختیار سے بے اختیار نہ کیا جائے بلکہ اسے یہ اختیار حاصل ہے تو اس کو مزید تقویت دی جائے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھا جائے کہ جس کا حق ہے وہ بار بار جتائے نہیں کہ اس طرح حق کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

اسلام میں انسانوں کے حقوق کے لئے اصطلاح حقوق العباد استعمال ہوتی ہے۔ یوں تو حقوق العباد کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ہر درجہ ونوعیت کے رشتہ کا مرتبہ کے مطابق حق ہے۔ ان میں سے چند ایک حقوق العباد درج ذیل ہیں۔

شخصی/ذاتی حقوق۔ والدین کے حقوق۔ اولاد کے حقوق۔ میاں بیوی کے باہمی حقوق۔ رشتہ داروں کے حقوق۔ اساتذہ کے حقوق۔ ہمسایوں کے حقوق۔ مسافروں کے حقوق۔ غیر مسلموں کے حقوق۔

اب ان حقوق کی مختصراً وضاحت کی جاتی ہے۔

شخصی/ذاتی حقوق: جیسے کہ اس سے قبل ذاتی یا شخصی حقوق کا ذکر کیا گیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو سب سے پہلے اپنی ذات پر اپنا حق پورا کرنا چاہئے۔ اپنے جسم وجان کو آرام وسکون مہیا کرنا، خود کا حق ہے۔ اپنی ضرورتیں اور حاجتیں جائز طریق سے پورا کرنا شخصی یا ذاتی حق ہے۔ ہر شخص کو اپنا ہر لحاظ سے خیال اور دھیان رکھنا چاہئے۔ اسلام میں اپنی شخصیت بنانا، اسلامی طریقوں پر عمل پیرا ہونا، اسلامی تعلیمات اپنانا، ذاتی حقوق کے ہی زمرے میں آتا ہے۔ اپنی قابلیتوں، صلاحیتوں اور اہلیتوں کو استعمال کرنا بھی ذاتی یا شخصی حق ہے۔

والدین کے حقوق: والدین کے لئے دعائے مغفرت ان کا حق ہے۔

☆ ربنا اغفرلی والوالدی (سورۃ ابراہیم 41)

ترجمہ:۔ ''اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔''

اسلام میں والدین کے حقوق کو اہم اور ضروری قرار دیا گیا ہے۔ والدین کی عزت، خدمت اور اطاعت ہر حالت میں کرنا ان کا حق ہے۔ یہ حق اللہ تعالیٰ نے والدین کو ان کی اولاد پر دیا ہے۔ والدین کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک شخص حضور پاک ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں مالدار اور صاحب اولاد ہوں۔ کیا میرے والدین بھی میرے مال کے محتاج ہیں۔ حضور پاک ؐ نے فرمایا! ''تم بھی اپنے باپ کا مال ہو اور تمہارا سب اثاثہ بھی۔'' (ابوداؤد)

ایک شخص حضور پاک ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کرنے لگا یا رسول اللہ! والدین کا اولاد پر کیا حق ہے؟ حضور پاک ؐ نے فرمایا! ''وہ تیرے لئے جنت بھی ہیں اور دوزخ بھی'' (ابن ماجہ) اس حدیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ والدین کا حق ہے کہ اولاد ان کی خدمت

کرے اور خدمت کرنے سے جنت ملے گی۔ لیکن خدمت نہ کرنے اور نافرمانی کرنے اور عزت وتکریم نہ کرنے سے دوزخ ملے گا۔ والدین میں ماں کا درجہ والد کی نسبت زیادہ ہے۔ اسلام میں مرتبہ کے لحاظ سے حقوق کو ترتیب دیا جاتا ہے۔

ماں کا مرتبہ: ماں کی خدمت کرنا، اولاد پر ماں کا حق ہے۔ ماں دنیا میں تمام اعزہ واقارب سے زیادہ عزت واحترام کے لائق ہے۔ ماں اپنے بچوں کو قبل از پیدائش اور بعد از پیدائش ہر لحاظ سے متعدد مشکلات کے باوجود پالتی ہے۔ ماں تمام قسم کی تکالیف کو برداشت کرتی ہے اس لئے اس کا مرتبہ باپ کی نسبت زیادہ ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص حضور پاک کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ حضور پاکؐ نے فرمایا! تیری ماں۔ اس نے عرض کیا پھر کون؟ حضور پاکؐ نے فرمایا تیری ماں۔ اس نے تیسری دفعہ عرض کیا اس کے بعد کون؟ حضور پاکؐ نے فرمایا! تیری ماں اس شخص نے تین دفعہ پوچھا تو حضور پاکؐ نے تینوں مرتبہ ماں کا حق بتایا جب اس شخص نے چوتھی بار پوچھا کہ اس کے بعد کون؟ تو حضور پاکؐ نے فرمایا تیرا باپ اور اس کے بعد مرتبہ وار دیگر رشتہ دار۔ (بخاری ومسلم)

اس واقعہ سے ماں کے حق کے بارے میں سب سے بڑے مرتبے کا پتہ چلتا ہے۔

ماں کے اولاد پر حق کے بارے میں مزید ایک واقعہ سے وضاحت ہوتی ہے۔ ایک صحابیؓ نے حضور پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہؐ! میں جہاد میں شرکت کرنا چاہتا ہوں اور مشورہ حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ حضور پاکؐ نے فرمایا ''کیا تمہاری ماں زندہ ہے''۔ صحابیؓ نے عرض کیا ہاں۔ حضور پاکؐ نے فرمایا تو اسی کی خدمت میں لگے رہو۔ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔'' (الترغیب والترہیب للمنوزی)۔

باپ کا مرتبہ: ماں کے بعد دوسرا بڑا درجہ یا مرتبہ باپ کا ہے۔ اسلام میں باپ کا احترام اولاد پر لازم بتایا گیا ہے۔ یعنی باپ کا یہ حق ہے کہ اولاد اس کی عزت وتکریم، احترام اور خدمت کرے۔

ماں کے ساتھ باپ مرتبہ کے لحاظ سے بچوں کے لئے محسن ہستی ہے کہ بچوں کی نشوونما، تعلیم وتربیت اور پالنے پوسنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اولاد کے حقوق: اسلام میں جس طرح والدین کے حقوق اولاد پر ہیں اس طرح اولاد کے حقوق بھی والدین پر ہیں۔ اسلام سے قبل مفلسی اور دیگر وجوہات کی بنا پر اولاد کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ لیکن تعلیمات اسلام میں اولاد یعنی بچوں کو زندگی، علاج، رہائش، لباس، بنیادی ضروریات، تعلیم وتربیت، اور پیار ومحبت کے حقوق حاصل ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

''اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے۔ ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے''۔ (سورۃ الاسراء۔31)

حضور پاکؐ سے ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے آپؐ نے فرمایا! شرک۔ صحابیؓ نے دوبارہ پوچھا اس کے بعد حضور پاکؐ نے فرمایا۔ والدین کی نافرمانی۔ صحابیؓ نے دوبارہ پوچھا کہ اس کے بعد تو آپؐ نے فرمایا ''تم اپنی اولاد کو اس خوف سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے کھانے میں حصہ بٹائے گی اسلام میں اولاد کے اپنے والدین پر بے حد حقوق ہیں۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق: اسلام میں میاں بیوی کے آپس میں باہمی حقوق پر زور دیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں کے خوشگوار

تعلقات ہی کی وجہ سے گھر کا ماحول اور خاندان کی تربیت بہتر ہو سکتی ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے۔دستور کے موافق مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے''۔(سورۃ البقرہ)

حضور پاکؐ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہے۔''اسلام میں بچوں کی تربیت اور گھر کو جنت بنانے کے لئے میاں بیوی کو آپس میں خوشگوار تعلقات رکھنے کے لئے باہمی حقوق کی ادائیگی کی تلقین کی گئی ہے۔

رشتہ داروں کے حقوق: عزیز او قارب کے حقوق بھی اسلام میں بیان کئے گئے ہیں قرآن مجید میں ارشاد ہے''رشتہ دار کو اس کا حق دو۔''(سورۃ الاسراء۔26)

حضور پاکؐ کا ارشاد ہے''رشتہ دار سے تعلق توڑنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا''۔

اہل خانہ کے بعد سب سے اہم رشتہ دار ہیں۔اپنے رشتہ داروں،عزیز و اقارب کا خیال رکھنا ان کا حق ہے۔اگر آپ صاحب ثروت ہیں اور کچھ رشتہ دار غریب ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ سب سے پہلے ان کی مدد کریں۔

اساتذہ کے حقوق: اسلام میں اساتذہ کے حقوق کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔شاگردوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے استاد کا احترام کرے۔اساتذہ کا رتبہ بہت بلند ہے حضور پاک صلعم کا ارشاد ہے۔''مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے''۔اساتذہ ہی انسانوں کی صحیح سمت میں تربیت کرتے ہیں تو عظیم قوم بنتی ہے۔استاد کی حیثیت بیان کرتے ہوئے حضور پاک صلعم نے فرمایا''تیرے تین باپ ہیں ایک وہ جو تجھے وجود میں لایا دوسرا وہ جس نے تجھے اپنی بیٹی دی اور تیسرا وہ جس نے تجھے علم کی دولت سے مالا مال کیا۔''

استاد کا احترام شاگردوں پر اس کا حق ہے۔

ہمسایوں کے حقوق: اسلام میں پڑوسیوں سے حسن سلوک سے پیش آنے کا درس دیا گیا ہے۔پڑوسیوں سے اچھا برتاؤ ان کا حق ہے۔رشتہ دار پڑوسی،غیر رشتہ دار پڑوسی خواہ وہ غیر مسلم ہی ہوں اور وہ پڑوسی جن سے عارضی طور پر تعلقات قائم ہوئے ہوں۔ان سب کا احترام کرنے سے معاشرے میں خوشگواری میں اضافہ ہوتا ہے۔

مسافروں کے حقوق: مسافر بھی ایک طرح کے پڑوسی ہوتے ہیں خواہ ان سے عارضی طور پر سفر کے دوران میں تعلق پیدا ہوتا ہے۔قرآن نے اس کو صاحب الجنب (پہلو والا) کہا ہے،اس لئے مسافروں کا اپنے ساتھی مسافروں پر حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کا احترام کریں اور ضرورت کے وقت مدد کریں۔

غیر مسلموں کے حقوق: غیر مسلموں سے اچھے برتاؤ اور حسن سلوک کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ وہ آپ کے ساتھ بہتر طور پر پیش آئیں۔مذہب کا مقصد اور اہمیت معاشرتی فلاح و بہبود اور بھلائی پھیلانا ہے۔اس لئے اگر کسی ملک میں غیر مسلم آباد ہوں تو ایک شہری کی حیثیت سے ان کو بھی دیگر شہریوں کی طرح وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں۔شہری کی حیثیت سے ان کا احترام کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔

فرائض (Responsibilities)

اسلام میں جہاں حقوق انسانی کی بات کی گئی ہے وہاں انسانوں پر ذمہ داریاں بھی لاگو کی گئی ہیں۔ انہی ذمہ داریوں کو فرائض کہتے ہیں۔ حقوق، ضرورت اور حاجات پوری کرنے کے لئے ہوتے ہیں جب کہ ذمہ داریاں یعنی فرائض دوسرے کا احترام، احساس اور تنظیم وترتیب اور نظم ونسق کے لئے ہوتے ہیں۔ حقوق وفرائض کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اسلام میں جہاں حقوق دیئے گئے ہیں وہاں ذمہ داریاں بھی سونپی گئی ہیں۔ ذمہ داریاں یعنی فرائض نبھانے سے معاشرے میں بہتری اور بھلائی پھیلتی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر معاشرتی اصلاح ہوتی ہے۔ انہی ذمہ داریوں کو اخلاق حسنہ بھی کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے اخلاقی اقدار کی پاسداری یقیناً مذہبی فریضہ ہے۔

مسلمانوں کو اسلام نے لاتعداد فرائض سونپے ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

ایمانداری، رواداری، ایفائے عہد، سچائی، احترامِ انسانیت، رزقِ حلال، عدل وانصاف، ایثار وغیرہ۔

اسلام نے مسلمانوں کو ایمانداری، دیانت داری سچائی اور عدل وانصاف سے تمام تر معاملات پورے کرنے کی ہدایت دی ہے۔ معاشی اور معاشرتی ماحول میں امانت، دیانت اور سچائی کو اپنانا چاہئے۔ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے کہ ''بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو۔'' (سورۃ النسا)

حضور پاکؐ اس کی عملی مثال تھے۔ اس لئے ان کو صادق اور امین پکارا جاتا تھا۔ حضور پاکؐ نے فرمایا کہ سچائی انسان کو آفت سے محفوظ رکھتی ہے اور جھوٹ اسے تباہ کر ڈالتا ہے

اسی طرح عہد کو نبھانا، وعدہ کر کے پورا کرنا معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے نہایت ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اور اللہ کا عہد پورا کرو۔ تم کو یہ حکم کر دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو'' (سورۃ الانعام)

حضور پاکؐ نے فرمایا:

☆ لادین لمن لا عهد له

ترجمہ:۔ ''جسے وعدے کا پاس نہیں اس میں دین نہیں۔''

عدل وانصاف میں گواہی کا بڑا عمل دخل ہے۔ اسلام میں لوگوں کو تلقین کی گئی ہے کہ سچی گواہی دو۔ عدل وانصاف کی وجہ سے معاشرتی توازن پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔

''اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے انصاف کی گواہی دینے اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ کے۔'' (سورۃ المائدہ ۸)

احترامِ انسانیت بھی مسلمانوں کی اہم ذمہ داری یا فرض ہے۔ مسلمانوں پر لاگو ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کی بھلائی کے لئے جملہ معاملات میں احترام کو مدنظر رکھیں۔ احترامِ قانون، احترامِ زندگی اور احترامِ نظامِ اسلام پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ ایثار اور قربانی سے زندگی گزارنی چاہیے۔

مسلمانوں کا اہم فرض یہ بھی ہے کہ رزق حلال کمایا جائے۔ لوٹ مار اور دھوکہ دہی سے کمائی ہوئی دولت وروزی میں برکت نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المومنون میں ارشاد فرمایا ہے:

''کھاؤ ستھری اشیا اور کام کرو بھلا''

اسی طرح تمام انسانوں کو تلقین فرمائی گئی:

''اے لوگو: کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ'' (سورۃ البقرہ)

''اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو'' (سورۃ البقرہ)

''اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق'' (سورۃ البقرہ)

جان و مال و عزت و آبرو کا تحفظ کرنا بھی ہر مسلمان کا فرض اوّلین ہے۔ تعلیم حاصل کرنا اور بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کرنا بھی فرض ہے۔ اسلام میں جس طرح فرائض پورے کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ جھوٹ، غیبت، چوری، گالی گلوچ و دیگر رذائل سے بچیں۔ مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے کہ زندگی کو اپنے اور دوسروں کے لئے خوشگوار بنائے۔ منع کی گئی اشیا اور کاموں سے پرہیز کرے۔ برائی سے نفرت کرے۔ تفرقہ نہ ڈالے۔ اسی طرح حدیث مبارک ہے کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔''

اسلام میں معاشرتی انصاف (Social Justice in Islam)

معاشرہ ہر وقت بدلنے والے سماجی تعلقات کا تانا بانا ہوتا ہے۔ جب افراد کے درمیان سماجی تعلقات پروان چڑھتے ہیں تو علم و فن، رسوم و رواج، اخلاق و عادات اور عقائد و اقدار بھی ساتھ ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔

معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی مل جل کر رہنے کے ہیں۔ معاشرے سے مراد لوگوں کی ایسی گروہ بندی ہے جو اپنے مشترکہ مفادات کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ معاشرے کے افراد میں وحدت عمل، فکری ہم آہنگی، ذہنی یک جہتی کا ہونا ضروری ہے۔ بعض اوقات معاشرہ جغرافیائی حدود کا پابند نہیں ہوتا جیسے بین الاقوامی تنظیمیں اور مذہب کی بنیاد پر قائم معاشرہ وغیرہ۔

معاشرے میں رسوم وروایات کا اثر صرف افعال وحرکات پر نہیں ہوتا بلکہ یہ افراد کے اخلاق و عادات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر معاشرے میں افراد کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کردار ادا کرنا ہوتا ہے جیسی کسی کی حیثیت ہوتی ہے اس سے اسی قسم کے کردار کی توقع کی جاتی ہے۔

مسلم معاشرہ: مسلم معاشرے سے مراد ایسا معاشرہ ہے جس کی سیاسی مذہبی، معاشرتی اور معاشی بنیادیں اسلامی اصولوں کے مطابق رکھی گئی ہوں۔ مسلم معاشرے میں ہر شعبہ زندگی قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق قائم کیا گیا ہے۔ جس کے افراد کا ہر عمل اسلامی تعلیمات کی عکاسی کرتا ہے۔

مسلم معاشرے میں افراد فکر و عمل، علم و فن، رسوم و رواج، اخلاق و عادات، اعتقادات عقائد و اقدار غرضیکہ تمام تر اصول اسلامی تعلیمات کے مطابق بنائے جاتے ہیں اور ہر فرد اسلامی طرزِ زندگی کا پیکر ہوتا ہے۔

انفرادیت: مسلم معاشرہ کی نشو ونما اشاعت اسلام سے ہوئی۔ مسلمان جہاں کہیں بھی گئے وہ اعلیٰ و برتر اسلامی معاشرتی اقدار اپنے ساتھ لے کر گئے یہی وجہ تھی کہ مسلم معاشرہ دوسرے معاشروں کی نسبت نمایاں اور منفرد ہوتا ہے۔ مسلم معاشرے میں طرزِ زندگی کو قرآنی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔ ابتدا میں مسلمان قوم کے معاشرتی انصاف واقدار کا خوب چرچا ہوا اور لوگ مسلم معاشرے میں شامل ہوتے چلے گئے۔

اطاعتِ الٰہی: مسلم معاشرے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ معاشرتی لحاظ سے لوگوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ خدا کی زمین پر خدائی قانون لاگو ہوتا۔ کسی فرد یا بادشاہ کی بجائے خدائے برتر کے سامنے سجدہ ریز ہوا جاتا ہے۔ اسلام کے لغوی معنی اطاعت اور مکمل سپردگی کے ہیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ معاشرے میں امن وسلامتی اور آشتی پائی جائے۔ اسلامی قانون کے سامنے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے ہی کا نام اسلام ہے۔ جب خدا کی زمین پر خدا کے قانون کی حکومت ہو تو انسان کی شخصیت پروان چڑھتی ہے۔ معاشرتی انصاف مہیا ہوتا ہے۔ اسلام انسانی شخصیت کی نشو ونما کے لئے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں آزادانہ ماحول میں اطاعتِ خداوندی کے ذریعے مسلمان کی معاشرتی، ثقافتی، ذہنی اور فکری نشو ونما ہوتی ہے۔

مسلم معاشرہ وہ معاشرہ ہے جس میں مساوات، اخوت، بقائے باہمی، احترامِ انسانیت اور رواداری کی عملی مثالیں قائم کی جاتی ہیں۔ حضرت محمد ﷺ نے مدینہ میں ایسے معاشرے کی بنیاد ڈالی جس نے بنی نوع انسان کو سیاسی، سماجی اور انسانی یک جہتی کا درس دیا۔

قانون کی بالادستی: مسلم معاشرے میں قانون کی بالادستی برقرار رکھی جاتی ہے۔ حق کے مطابق فیصلے کرنا سب سے بڑی اور افضل عبادت ہے۔ قاضی عدالتوں کے قیام سے معاشرے میں عدل وانصاف کے ذریعے احکام الٰہی کو پورا کیا جاتا ہے حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جس قاضی نے حق کو سمجھ کر صحیح فیصلہ کیا وہ جنت میں جائے گا۔'' حضور پاک ﷺ نے اپنے زمانے میں عدل وانصاف کا اعلیٰ معیار قائم کر کے قانون کی بالادستی کی ایسی مثالیں قائم کیں جو آنے والے حاکموں اور ذمہ دار لوگوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔

مسلم معاشرے میں معاشرتی انصاف کے لئے اونچ نیچ کا نہیں بلکہ عزت وتکریم اور تقویٰ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ فیصلے کے وقت اللہ کی نگاہ میں ہر کوئی برابر ہے۔ حضور پاک ﷺ کے دست مبارک کی ایک چھڑی سے ایک صحابیؓ کو ہلکی سی خراش آ گئی اور تکلیف کا اظہار کرنے پر حضور پاک ﷺ نے اپنی پشت مبارک سے کپڑا اٹھا کر صحابیؓ سے فرمایا کہ ''بدلہ لے لو۔''

معاشرتی فلاح و بہبود: مسلم معاشرے میں افراد کو منظم کیا جاتا ہے۔ معاشرتی فلاح و بہبود کی خاطر انہیں بھلائی کے کام کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ باجماعت نماز ادا کرنے پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ آپس میں میل جول بڑھے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''وہ مسلمان نہیں جو اپنا پیٹ بھرے لیکن اس کا پڑوسی بھوکا سوئے۔'' حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''مل جل کر رہو۔ آپس میں مت کٹ مرو۔ دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کرو۔ مشکلات مت پیدا کرو۔''

مسلم معاشرے میں معاشرتی انصاف کا تقاضا ہے کہ معاشرتی فلاح و بہبود کی خاطر لوگوں کو خوشگوار ماحول مہیا کیا جائے۔ معاشی ناانصافیوں سے نجات دلائی جائے۔

انسان دوستی: مسلم معاشرے میں معاشرتی انصاف کی خاطر لوگوں میں رواداری، بھائی چارے اور انسان دوستی کی تحریک پیدا کی جاتی ہے۔ جس میں مساوات اور اخوت کی بنیاد پر ایک عالم گیر برادری کے قیام کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسلم معاشرے میں سیاسی، سماجی اِصلاح کا

انقلابی عنصر پایا جاتا ہے۔لوگ دین ودنیا کی فلاح کی خاطر معاشرتی زندگی کو اسلام کی اصل روح کے مطابق ڈھالتے ہیں بھائی چارہ، ہر کسی کی عزتِ نفس اور معاشی ومعاشرتی تحفظ پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اسلام میں توحید کا تصور، رنگ، خون، زبان، نسل اور وطن کے مادی تعصبات کو نظر انداز کر کے روحانی سطح پر تمام نوع انسان کو ایک عالم گیر برادری کی شکل دیتا ہے۔تہذیب وتمدن کی دنیا میں مسلم معاشرے کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

عدل وانصاف: قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے کہ ''اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔'' (سورۃ النساء) حضور پاکؐ کا ارشاد ہے کہ ''جو قوم عدل وانصاف ترک کر دیتی ہے۔تباہی اور بربادی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔'' مسلم معاشرے میں معاشرتی انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ عدل وانصاف صرف نظام حکومت چلانے کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انصاف سے کام لیا جاتا ہے۔ انصاف کا دائرہ کار محدود نہیں بلکہ یہ ہمہ گیر انسانی عدل ہے جو زندگی کے تمام مظاہر اور سرگرمیوں پر چھایا ہوا ہے۔

مسلم معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر عدل وانصاف کا تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض پوری دیانت داری سے ادا کرے اور دوسروں کے حقوق غصب نہ کرے۔خرید وفروخت میں عدل وانصاف کا لحاظ رکھا جائے۔ باٹوں اور پیمانوں میں کمی بیشی کر کے دوسروں کو نقصان پہنچانا اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔ ہر شخص کو اپنی ذمہ داری پوری طرح نبھانے کی تلقین کی جاتی ہے۔

معاشرتی مساوات: مسلم معاشرے کی سنگ بنیاد انسانی مساوات ہے۔تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ان سب کی اصل ایک ہے۔رنگ ونسل زبان اور قوم وملک کے نام پر تقسیم صرف شناخت کے لئے ہے نہ کہ اختلافات پیدا کرنے کے لئے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔تم میں سب سے زیادہ عزت وفضیلت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

حجتہ الوداع کے موقع پر حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔''سب انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر فوقیت حاصل نہیں۔''

مسلم معاشرے میں مساوات اور برابری کا اصول اپنایا جاتا ہے۔کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔اللہ کے نزدیک صرف کوئی شخص بڑا یا چھوٹا اپنے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔وہ شخص بڑا ہے جو متقی اور پرہیز گار ہو جس کے اعمال اچھے ہوں اور جو اسلام کے اصولوں پر سچے دل سے عمل کرتا ہو۔اسلام میں قانونی اور معاشرتی مساوات پر زور دیا جاتا ہے۔ مسلم معاشرے میں قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ معاشرتی مساوات کا عملی نمونہ مساجد میں نظر آتا ہے۔جہاں رنگ ونسل، امارت وغربت اور قوم وملک کے فرق کو بالائے طاق رکھ کر برابر کھڑے ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور سربسجود ہوتے ہیں۔معاشرتی مساوات سے مراد یہ ہے کہ عبادت، مذہبی رسوم، سماجی تقریبات اور قومی اداروں میں سب کے لئے برابری کا اصول کار فرما ہو کیونکہ سب خدا کے محتاج ہیں۔

اخوت: اسلام میں معاشرتی انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر لحہ پر کام میں معاشرتی اخوت پیدا کی جاتی ہے۔ مسلم معاشرے کی عام فضا تعاون امداد، خیر خواہی، محبت، ایثار اور بھائی چارے کی ہوتی ہے۔ظلم، غیبت، چغلی، کینہ پروری، مکر وفریب، حسد، بغض، عناد، جھوٹ، تہمت

اور دھوکہ دہی جیسے تمام رذائل سے پرہیز کیا جاتا ہے۔قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ'' وہ لوگ جو مومن ہیں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

معاشرتی اخوت کی بہترین عملی مثال اس وقت دیکھنے میں آئی جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو مدینہ والوں نے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا اور اپنی جائیدادوں اور کاروبار میں مہاجرین کو شریک کیا۔اسلام میں معاشرتی انصاف کی اہمیت یہ ہے کہ اخوت کے جذبے کو فروغ دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد پر زور دیا ہے۔یتیموں بیواؤں اور ناداروں سے مشفقانہ سلوک کرنے کی تلقین کی ہے۔ خیرات اور زکوٰۃ، محدود مالی وسائل والوں میں تقسیم کرنے کا کہا گیا ہے۔سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور وہ اس سے خیانت نہیں کرتا اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور مصیبت کے وقت اس سے کنارہ کش نہیں ہوتا۔'' ایک اور موقع پر حضور پاک ﷺ نے فرمایا'' آپس میں کینہ مت رکھو۔حسد نہ کرو۔ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو اور سب بھائی بھائی بن جاؤ۔''

مسلم معاشرے میں اگر اخوت، رواداری، معاشرتی مساوات، معاشرتی انفرادیت، اطاعتِ الٰہی، معاشرتی فلاح و بہبود، اورانسان دوستی کے سنہری اصولوں پر عمل کیا جائے تو مسلم معاشرہ جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔اور الفت، مروت ایثار اور قربانی باہمی تعاون اور بے لوث خدمت کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔

مشقی سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1:۔ اسلامی اقدار سے کیا مراد ہے؟ تفصیلاً بیان کریں۔

2:۔ اسلام میں اللہ کا تصور کیا ہے؟

3:۔ اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کریں جس سے اللہ کے تصور کی وضاحت ہوتی ہو۔

4:۔ اللہ اور انسان کے درمیان کیا تعلق ہے؟

5:۔ اسلام میں حقوق العباد کیونکر ضروری ہیں؟ وضاحت کریں۔

6:۔ اسلام میں فرائض کی اہمیت پر نوٹ لکھیں۔

7:۔ اسلام میں حقوق کی کیا اہمیت ہے؟

معروضی طرز (Objective Type)

سوال 1:۔ درج ذیل فقرات میں مناسب اور ضروری اصطلاحات یا الفاظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

1:۔ اقدار کا تعین خیر اور.......... کی وجہ سے ہوتا ہے۔

2:۔ واصل بن عطا مسلمانوں کی فکری تحریک.......... کے بانی تھے۔

3:۔ مسلمانوں کی فکری تحریک اشاعرہ کے بانی.......... تھے۔

4:۔ اسلامی عقائد میں سب سے بنیادی عقیدہ............. ہے۔

5:۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ بے شک اللہ ہر شے پر............ ہے۔

6- سورۃ النّاس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو پھر............ سے کرو۔

7- اسلام میں حقوق کی تلقین اس طرح ہے کہ اس سے انفرادی اور............ بھلائی پھیلتی ہے۔

8- ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے حقوق............ کا۔

10- حضور پاکؐ نے فرمایا کہ جسے وعدے کا پاس نہیں اس میں............ نہیں۔

سوال 2:۔ ذیل میں دیئے گئے ممکنہ جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کیجئے۔

1:۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ یہ کس سورۃ کی آیت ہے۔

1۔سورۃ البقرہ 2۔سورۃ التین 3۔سورۃ النساء 4۔سورۃ اخلاص

2:۔ قرآن مجید کا خصوصی موضوع ہے۔

1۔انسانیت 2۔مادیت 3۔معاشرہ 4۔سائنس

3:۔ اسلامی اقدار کا پہلا منبع ہے۔

1۔فلسفہ 2۔ذاتی سوچ 3۔قرآن مجید 4۔اخلاقی قانون

4:۔ اس آیت مبارک میں کس کی طرف اشارہ ہے۔ اس جیسی کوئی شے نہیں۔"

1۔خدا 2۔حضرت آدمؑ 3۔حضرت محمدؐ 4۔آسماں

5:۔ مسلمانوں کی فکری تحریک معتزلہ کے بانی تھے۔

1۔الکندی 2۔واصل بن عطا 3۔حضرت حارثؓ 4۔حضرت بلال حبشیؓ

6:۔ قل ھواللہ احد۔ یہ آیت مبارکہ کس سورۃ کی ہے۔

1۔الناس 2۔کوثر 3۔اخلاص 4۔یٰسین

7:۔ اللہ کے برابر کسی کو قرار دینا کیا ہوتا ہے۔

1۔شرک 2۔برابری 3۔بدعت 4۔چغلی

8:۔ اسلامی عقائد میں سب سے اولین عقیدہ ہے۔

1۔توحید 2۔ایمان 3۔اخلاق 4۔حج

9:۔ قرآن مجید کی سورۃ الناس میں اللہ کو آسمانوں اور زمین کا کہا گیا ہے۔

1۔نور 2۔مالک 3۔مصور 4۔دوست

10:۔ حقوق العباد میں سب سے پہلے اور اہم حقوق ہیں۔

1۔والدین کے 2۔ہمسایوں کے 3۔رشتہ داروں کے 4۔دوستوں کے

سوال 3: کالم "الف" اور کالم "ب" میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم "ج" میں درج کریں۔

کالم "الف"	کالم "ب"	کالم "ج"
☆ اقتدار کسی بھی قوم یا فرد	بہترین صورت میں پیدا کیا	
☆ ۔مذہب بھی	جیسی کوئی شے نہیں	
☆ ہم نے انسانوں کو	واصل بن عطا ہے۔	
☆ اللہ	اولاد پر حق ہے۔	
☆ معتزلہ کے بانی	باپ کا ہے۔	
☆ اللہ زمینوں اور آسمانوں کا	کی شناخت ہوتی ہیں۔	
☆ اللہ اور انسان کے	زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے۔	
☆ پہلی آیت مبارکہ میں	نور ہے۔	
☆ ماں کے بعد دوسرا بڑا درجہ	درمیان تعلق پایا جاتا ہے۔	
☆ ماں کی خدمت کرنا	پڑھنے کا ذکر ہے۔	

باب 8

حکمت: مفہوم اور دائرہ کار (Hikma; Meaning and Scope)

حکمت سے مراد علم وفکر سے پیدا ہونے والی بصیرت (Vision) ہے۔ جس کی مدد سے فکری منازل سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حسی ادراک، استدلال اور سوچ بچار اپنے مخصوص دائرہ میں ہمیں ہمہ قسم معلومات مہیا کرتے ہیں لیکن حکمت کا مقام ان سے افضل ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ ''جسے حکمت عطا کی اسے بہت بڑی بھلائی سے نوازا گیا۔''

اس آیت مبارک میں حکمت کو وسیع معنوں میں بیان کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے جو فلاح و بہبود اور بھلائی کی سب سے بڑی صورت بتلائی ہے وہ حکمت ہے۔ خدا نے اپنے خاص بندوں کو جن کی ذہانت درجہ کمال پر ہوتی ہے جن کا ذہانتی حاصل قسمت فطانت کے درجے کا ہے۔ انہیں سوچنے سمجھنے اور فکر کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اس سے بڑھ کر دانائی اور حکمت کی دولت بخشی ہے۔ اس دولت کا جو مالک ہے، وہ یقیناً بہت بڑی بھلائی سے نوازا گیا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں سورۃ البقرہ کی آیت مبارک ہے:

ترجمہ: ''تو پاک ہے۔ ہم کو کوئی علم نہیں لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بے شک تو جاننے والا حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیغام دیا ہے کہ انسان اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ ہم جانتے نہیں ہیں۔ علم نہیں رکھتے۔ اے اللہ تو ایسی پاک ہستی ہے کہ تو نے ہی ہمیں علم دیا اور سکھایا۔ ہم تو علم نہیں رکھتے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تو ہی جاننے والا ہے اور حکمت والا ہے۔

اس آیت مبارکہ سے پہلے بیان کردہ آیت میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ حکمت اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے۔ سورۃ بقرہ کی اوپر درج آیت مبارکہ کو اس کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو مفہوم کچھ یوں بنتا ہے کہ اللہ جو حکمت والا ہے، اس نے اپنی حکمت والی صفت انسان کو بھی عطا کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو متعدد خوبیوں اور صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ انسان انہی صلاحیتوں، اہلیتوں اور قابلیتوں کی بنا پر اشرف المخلوقات ہے۔ وہ ذہن اور ذہانت کی بنا پر استدلال کا فن جانتا ہے۔ اس کی پرواز قوت متخیلہ کے زور پر بلند سے بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ بالآخر انسان خدا کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جسے خدا نے حکمت کہا ہے۔ اسی حکمت کی وجہ سے خدائی احکام کو سمجھا جاتا ہے۔ انسان موجودات کے اسرار و رموز سے پردہ ہٹا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مسلمانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو کتاب یعنی قرآن مجید کی تعلیم دیں۔ کتاب کی منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔ لوگوں میں انفرادی اور اجتماعی طور پر خوبیوں کو اجاگر کریں اور برائیوں کو دور کریں۔ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا ہے کہ خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔

ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایسے ہی مفہوم کی آیات مبارکہ موجود ہیں۔ ان آیات مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب اللہ یعنی قرآن مجید پڑھ کر سنانے کے علاوہ نبی کے فرائض میں کتاب وحکمت کی تعلیم دینا بھی شامل ہے۔

حکمت ودانائی سکھانا ایک عظیم کام ہے۔ جو فرد بھی اس منصب پر فائز ہے، وہ یقیناً خود بھی عظیم ہے۔ حکمت سکھانا گمراہی کے اندھیروں سے نکالنا ہے۔ جہالت کی گہرائیوں سے نجات دلانا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ جمعہ میں ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: "وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے اُمیوں میں انہیں میں سے (محمد ﷺ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔"

ان آیات مبارکہ سے واضح ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں ایک ایسی صلاحیت رکھی ہے جس کی مدد سے وہ علمی وفکری معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں جس طرح تعلیم دی گئی، اسی طرح حکمت ودانائی بھی سکھائی گئی ہے۔ حکمت کے اصول بتائے جاتے ہیں اور حکمت سکھائی بھی جاتی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تر اہل علم اور اہل جہاد ہیں۔ اہل علم اس وجہ سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لائے تھے اور اہل جہاد اس وجہ سے کہ انہوں نے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت پر اپنی تلواروں سے جہاد کیا۔"

علاوہ ازیں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ جو حکمت ودانائی کی تعلیم حاصل نہیں کرتے، ذہانت یا عقل ودانش کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہوئے بھی اس سے استفادہ نہیں کرتے، وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی کم تر۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

ترجمہ: "وہ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔"

سوچ بچار اور فکر وتدبر انسان کو علم وآگہی کی نئی دنیا دریافت کراتے ہیں۔ حکمت رکھنے والا کبھی اندھے اعتقاد پر عمل نہیں کرتا بلکہ حکمت و اہمیت اجاگر کر کے تفہیم کے درجے تک پہنچتا ہے۔ یہی انسانیت کی معراج ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے اس عظیم نعمت سے نوازتا ہے۔ جس سے انسان کی عزت وتکریم میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسلام کی فکری اساس (Conceptual Basis of Islam)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حق کی دعوت کے بارے میں یہ ہدایت کی تھی کہ دنیا کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور ضرورت کے وقت بہترین انداز سے بحث ومباحثہ کرو۔ اسلام کی فکری اساس حکمت ودانائی اور اس کی اصلیت وحقیقت ہے۔

قرآن مجید میں بھی دعوت حق پیش کرنے کے لیے بہترین اور معیاری زبان، انداز، اسلوب اور طرزِ استدلال اختیار کیا ہے، قرآن مجید میں بار بار غور وفکر کرنے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں فکری جہاد کا ذکر ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: تم ان منکرین اسلام کا کہنا نہ مانو اور قرآن کے ذریعے ان سے پورا پورا جہاد کرتے رہو۔" (الفرقان)

اس آیت مبارکہ کا مطلب قرآن کے ذریعے جہاد کا مطلب قرآنی دلیلوں کو پیش کرنا ہے۔ اس طرزِ استدلال کے ذریعے اپنی بڑائی اور مخالفین کی کمزوری واضح کرنا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہے۔ فکری سطح پر اسلام میں پائی جانے والی حکمت و دانائی ہی اس کی اصلیت وحقیقت ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں بار بار غور وفکر کرنے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اسلام ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات ہے جو خدا اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی رشد وہدایات کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر کرتا ہے۔ ہر پہلو کو خدا کے نور سے منور کرتا ہے۔ انفرادی، اجتماعی، معاشرتی، تمدنی، مادی، روحانی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی ہر سطح پر اسلام فکری بنیادیں مہیا کرتا ہے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر ہی اسلام حقیقی دین ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ ہوا ہے:

ترجمہ: ''بے شک خدا کے نزدیک تو اصل دین اسلام ہے۔'' (آل عمران)

اسلام کی فکری اساس کا سب سے اہم پہلو ایمان ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے۔ ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح فکر پر قائم نہیں ہوسکتی۔ ایمان کے بعد دوسرا اہم اصول نیت یا ارادہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایمان لے آتا ہے لیکن اعمال صالح کے لیے نیت نہیں کرتا تو اس کا ایمان پختہ نہیں ہے۔ حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ ''تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' (بخاری)

علم وعمل، تصور وفعل، عقلیت وعملیت کی صحیح تصویر اسلام میں نظر آتی ہے۔ اصلی زور انسان کی عملیت پر دیا گیا ہے۔ بعض اوقات انسان کی تفہیم میں حیرانی کی صورت پیدا ہوسکتی ہے ممکن ہے کہ وہ کسی شے کی حقیقت سمجھ نہ سکے۔ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: ''عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تمہیں بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے ضرر رساں ہو اور ان باتوں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اللہ تعالیٰ عالم اور علیم ہے۔ اللہ نے قرآن مجید کے ذریعہ سے اسلامی تعلیمات اور حقیقت کا علم لوگوں تک پہنچایا ہے۔ قرآنی آیات پر غور وفکر کرنا ان کی حقیقت جاننے کے لیے لوگوں کو دعوت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''اور ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی۔ اس لیے کہ جو کچھ لوگوں پر نازل کیا گیا ہے ان پر ظاہر کردو تا کہ وہ غور وفکر کریں۔''

اسلام میں دینوی تعلیم کے ساتھ جو ہمہ گیر نظام زندگی پیش کیا ہے، وہ انسان کی دنیاوی فلاح کا بھی اتنا ہی ضامن ہے جتنا اُخروی فلاح کا۔ یہ ایک متوازن نظام حیات مرتب کرتا ہے۔ اسلام نے انسان کو عظیم مقام دیا ہے۔ خدا اعلیٰ صفات کا مالک ہے۔ اس نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ یا نائب مقرر کیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا پرتو انسان میں ظاہر کیا ہے۔ اس بنا پر انسان اشرف المخلوقات ہے کہ وہ جملہ مخلوقات سے اشرف واعلیٰ ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں خیر ہی خیر ہے۔ عقائد، ارکان اسلام اور عبادات سب کے پیچھے فکری اصول وضوابط پنہاں ہیں۔ یہ اصول اسلام کے لیے فکری بنیادیں مہیا کرتے ہیں۔ نماز قائم کرنے کی تلقین کی ہے تو اس کے فوائد بھی بیان کیے ہیں۔ روزہ، حج، زکوٰۃ سب کی اپنی اپنی حیثیت واہمیت ہے۔ غور وفکر کرنے والے ہی ان اصولوں کو سمجھ پاتے ہیں۔

اسلام کا مقصد کائنات کی جملہ مخلوقات کے لیے آسانیاں پیدا کرنا ہے۔ نباتات، حیوانات اور انسانوں کا الگ الگ مقصدِ تخلیق ہے۔ خدا نے سب کی درجہ بندی کے مطابق حیثیت کا تعین کیا ہے کسی کو بھی تکلیف اور الجھن میں مبتلا نہیں کیا۔ جانوروں سے پیار سے پیش آنے کی

ہدایت کی گئی ہے۔اس میں حکمت یہی ہے کہ جانداروں کے لیے تکالیف میں کمی کی جائے اور آسانیاں پیدا کی جائیں۔

توحید (Tauhid)

عقیدہ توحید سے مراد اللہ پر ایمان لانا ہے اور اسے ایک ماننا ہے جو تمہا زمین اور آسمان کے تمام خزانوں کا مالک ہے جس کا فضل و کرم بے حد وحساب ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

ایک اللہ پر ایمان لانا، زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا اسلام میں لازمی شرط ہے۔ اس ایک ہستی کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں۔ توحید کا عقیدہ انسان کو اللہ کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس عقیدے کو ماننے والا جانتا ہے کہ اللہ ہر چھپی اور کھلی چیز سے باخبر ہے۔ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

مسلمان ہونے کے لیے ایک اللہ پر ایمان لانا اوّلین شرط ہے۔ باقی تمام اعتقادات اس کے بعد آتے ہیں۔ رسول پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے رسول ہیں۔ ملائکہ پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں۔ موت اور آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ **اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب** ہو۔ ایسا کرنے سے انسان باہمت ہو جاتا ہے۔ خوف اور اندیشے ختم ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''پھر جب میری طرف سے کوئی ہدایت (دین وشریعت) آئے تو جو شخص میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ تو کچھ خوف واندیشہ ہوگا اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔'' (البقرہ)

ایک خدا پر ایمان لانے والے کو جب کوئی مشکل گھڑی درپیش ہو تو وہ اسی سے مدد مانگتا ہے۔ خدا اپنے بندے کی پکار سنتا ہے کیونکہ وہی واحد آقا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ترجمہ: ''مجھے پکارو (دعا کرو) میں تمہاری درخواست (دعا) کو قبول کروں گا۔''

خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ ہر شے کا خالق، مالک اور پروردگار ہے۔ ہر شے اس کی محتاج ہے اور وہ کسی شے کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا کوئی ساتھی نہیں، کوئی معاون نہیں، کوئی شریک کار نہیں۔ یہی اس کے ایک ہونے کی حکمت ہے کہ وہ یکتا ہے اور پورے نظام کائنات کو چلا رہا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشاد سے بھی اس کے واحد وقادر ہونے کا پتہ چلتا ہے:

ترجمہ: ''اے پیغمبرؐ! کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے آگے سر جھکانے والا ہوں۔'' (الانعام)

اللہ اپنے بندوں کو کبھی بے یار ومددگار نہیں چھوڑتا۔ حکیم ہے۔ عالم ہے۔ وہ سب کچھ جاننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ جاننے کے لیے درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہ دلوں کے بھید اور نیتوں کے ہر گوشے سے واقف ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کا پورا علم رکھتا ہے۔ پھر وہ صاحب قوت بھی ہے۔

عقیدہ توحید انسان میں انتہا درجے کی خودداری اور عزتِ نفس پیدا کرتا ہے۔ انسان کو آزادی اور حریت کا بلند مقام بخشتا ہے۔ ایک خدا تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ کوئی صاحب اختیار اور بااثر نہیں۔ عقیدہ توحید انسان کو خدا کے سوا تمام قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف کر دیتا ہے۔ وہ صرف خدا ہی کو مالک وآقا مانتا ہے۔ عقیدہ توحید سے انسان میں قناعت، بے نیازی، عزم وحوصلہ، نفس میں پاکیزگی،

صبر و توکل اور بہادری کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

عقیدہ توحید کی رو سے اللہ کی لاتعداد صفات ہیں تاہم صفات کے ساتھ وہ خود ایک ہے اور بلا شرکت غیر کائنات پر مکمل اختیارات رکھتا ہے۔ اگر آسمانوں اور زمین اس کی قدرت میں کوئی شریک کار ہوتا تو یہاں بہت سے ارادوں اور ذہنوں کی کارفرمائی کے نتیجے میں کائنات میں توافق اور تناسب ہرگز نہ ہوتا۔ کائنات میں یکسانیت اور وحدت صرف اور صرف ایک خدا کے ہونے کی وجہ سے ہے۔

اتحاد (Unity)

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور مل جل کر زندگی گزارنا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں اتحاد و یکجہتی سے افراد کا دیگر افراد سے خوشگوار تعلق پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان دوسروں کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فطری طور پر مدنی الطبع ہے۔ اس فطرت میں اخوت و بھائی چارے کی فضا کا ہونا ضروری ہے۔ اخوت و بھائی چارے کی بنا پر معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور اتحاد سے انفرادی و اجتماعی طور پر حوصلہ بڑھتا ہے۔ اسی حوالے سے اسلام کا ملت کا تصور جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اور مذہب کے تعلق سے لوگوں میں اخوت، بھائی چارے اور اتحاد کا تعلق استوار کرتا ہے۔ دشمن کا مقابلہ بھی متحد ہو کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ قدرتی آفات، جنگ و جدل، وباؤں اور دیگر مشکلات و مسائل سے نپٹنے کے لیے اتحاد و یکجہتی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر کسی قوم کے افراد بکھرے ہوئے ہوں، تو ضرورت کے وقت کوئی کسی کی مدد نہیں کرے گا۔ جس طرح پانی کے ایک قطرے کی علیحدہ کوئی خاص حیثیت نہیں ہوتی، لیکن جب وہ دوسرے قطروں کے ساتھ مل جاتا ہے تو سمندر بن جاتا ہے، اسی طرح اکیلا فرد کمزور ہوتا ہے لیکن جب قوم میں اتحاد و یکجہتی ہو تو وہی فرد طاقتور بن جاتا ہے۔ اسی لئے اسلامی تعلیمات میں اتحاد و یکجہتی پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اتحاد کی تعلیم کی مثال اس آیت مبارکہ میں اس طرح دی گئی ہے:

ترجمہ: ''اور سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔'' (آل عمران)

کوئی شخص تنہا زندگی کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ منفی طاقتوں سے لڑ نہیں سکتا، جب تک وہ قوم کے ساتھ متحد اور ہم نوا ہو کر کام نہ کرے۔ حدیث مبارکہ ہے: ''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسے دیوار، کہ ہر جزو (اینٹ) دوسرے جزو کو تقویت پہنچاتا ہے۔''

اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو ماننے والوں کا متحد ہونا ضروری ہے۔ اگر اتحاد ہوگا تو معاشرہ مضبوط ہوگا۔ اس کی بنیاد پر عالمگیر برادری کا تصور عملی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

اسلام کی یہ تعلیم بھی ہے کہ نیکی کے کاموں میں اتحاد کرنا چاہیے، برائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنے سے منع کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: ''بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور ظلم اور گناہ کی باتوں میں ہرگز باہمی امداد و تعاون نہ کرو۔'' (المائدہ)

متحد ہونے میں برکت ہے۔ اتحاد (Unity) لوگوں میں بھی ہوتا ہے اور قوموں میں بھی۔ ایک کہاوت ہے کہ اگر چڑیاں متحد ہو جائیں تو وہ شیر کی کھال اتار سکتی ہیں۔ ایسے ہی اگر لوگوں میں اتحاد ہو جائے تو وہ بڑے سے بڑے مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔

اتحاد کا نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ ہر کوئی حوصلہ سے کام لے کر اور اپنی صلاحیتوں کو یکجا کر کے اپنی شخصیت کو مضبوط بنا سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اتحاد و یکجہتی کا درس دیا گیا ہے۔ جس سے احساسِ ذمہ داری اور خیر کے کاموں میں مسابقت بڑھتی ہے۔ خیر خواہانہ فضا قائم ہوتی ہے اور لوگ رذائل کی نفی اور فضائل کا اثبات کرتے ہیں۔ خیر اور بھلائی کو اپناتے ہیں۔ یہی اسلامی تعلیمات کی تلقین ہے۔

استحکامِ آدمیت (Solidarity of Mankind)

اسلام کی فکری بنیادوں ہی کی ایک کڑی استحکام آدمیت ہے جب انسانیت کا احترام ہوگا، فرد اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرے گا، اپنے ہونے کا احساس دلائے گا تو آدمیت کے تصور کو استحکام حاصل ہوگا۔ استحکام آدمیت کے لیے قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں۔ جن کی تعلیمات کی روشنی میں آدمیت (Mankind) کے احترام اور عزت نفس (Self-respect) سے ابتدا کی جاتی ہے۔

احترام خودی ابتدائی عمل ہے۔ دوسرا مرحلہ استحکام آدمیت ہے۔ انسانی خودی کی تکمیل اس کی اپنی خوبیوں سے ہوتی ہے۔ ان خوبیوں کو بطریق احسن استعمال کرنے والی خودی مستحکم ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان، رسول پر ایمان اور پھر خدا اور رسول کے بتائے ہوئے راستے کو اپنانا استحکامِ آدمیت کے لیے لازمی ہے۔ اسلام میں اس نقطہ نظر کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ زندگی کا مقصد خدا کی خوشنودی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انسان کے دل میں فطری طور پر ایک امنگ یا جستجو ہوتی ہے۔ خدا اور رسول سے محبت خودی کو مستحکم کرتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: ''ان سے کہہ دو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری متابعت کرو۔ اللہ تم کو دوست رکھے گا۔'' (۳۔۳۹)

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے، وہ اللہ کے ساتھ سخت محبت رکھتے ہیں۔'' (۲۔۱۶۰)

اللہ سے محبت سے مراد اس کے احکام ماننا ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونا ہے۔ استحکام آدمیت بھی یہی ہے کہ انسان اسلامی تعلیمات پر پورا اترے۔ ان تمام تقاضوں کو پورا کرنا بھی انسان کی ذمہ داری ہے جو مقصدِ تخلیق کی تکمیل کرتے ہیں۔ انسان کا مقصد تخلیق انسانیت کی بھلائی، بڑائی اور اعلیٰ مقام حاصل کرنا، کائنات کو تسخیر کرنا ہے کیونکہ عالم افراد کے لیے ہیں نہ کہ افراد عالم کے لیے۔

رسالت (Prophethood)

رسالت وہ وسیلہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو جانا جاتا ہے۔ انسان کو الہامی ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اس دنیا میں جس انسان کو بھیجا وہ پیغمبر آدمؑ تھے۔ لوگوں کو اللہ کے پیغامات پہنچانے اور ان کی راہنمائی و ہدایت کے لیے ہزار ہا رسول دنیا میں تشریف لائے جن میں سے حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے ہم آگاہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے رسول کا انتخاب خود کرتا ہے۔ رسالت کے لیے انتخاب ایسے افراد کا ہوا تھا جو خدا کے نزدیک اس عظیم مقصد و منصب کے لیے موزوں تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: اللہ زیادہ جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغمبری کس کے سپرد کرنی ہے۔'' (الانعام:125)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی بھلائی، راہنمائی اور ہدایت کے لیے رسول پاکؐ کی ذات میں ایک مثالی حیثیت رکھی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے

:ترجمہ: ''بلاشبہ تمہارے لئے رسولؐ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔''

رسول پاک ﷺ نے خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ عقائد، عبادات اور اخلاقیات پر عمل کر کے دکھایا۔ رسول کی زندگی انسانوں کے لیے ایک ایسی مثال ہے جس کو سامنے رکھ کر وہ اپنے ہر قسم کے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنے احکام اور مرضی کے مطابق بندگی اور اطاعت کرانا چاہتا ہے۔ ان احکام واوامر کا پتہ انسان کو اللہ کے مبعوث کیے گئے رسولوں سے ہی چلتا ہے۔ خود انسان اپنی عقل سے ان احکام کو حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی اور وسیلہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے نظریۂ رسالت کی حکمت یہ ہے کہ رسول وجدان اور عقلی قوت سے ماوراوحی کے ذریعے اللہ کے احکام حاصل کر کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح جو ذمہ داری انسان کو اللہ کے دین پر چلنے کی سونپی گئی تھی، اس کا رسولوں اور انبیاء کے ذریعے پورا انتظام کر دیا گیا۔ اس ضروری انتظام کو دین کی اصطلاح میں رسالت کہتے ہیں اور جس وسیلہ سے یہ انتظام ہوتا ہے، اس ہستی کو رسول یا نبی کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کے علاوہ ذات وصفات باری تعالیٰ اور آخرت کی زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے رسول ایک اہم وسیلہ ہیں۔ رسالت ہی وہ ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور آخرت کا صحیح علم عطا کرتا ہے۔ رسول کے دیئے ہوئے پیغام کی بنیاد پر ہی اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لایا جاتا ہے۔

زندگی، موت، زندگی بعد از موت کے مشکل مذہبی مسائل کو بھی رسول پاکؐ کی ہدایات کی روشنی میں جانا جاتا ہے۔ اس طرح عوام الناس کا راہ راست سے بھٹکنے کا امکان نہیں رہتا۔ وہ گمراہی سے بچ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے خدا نے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کو دین اسلام اور شریعت نافذ کرنے کے لیے مبعوث کیا جو پیغامات اور احکاماتِ الٰہی حضور پاکؐ نے دیے، وہ ہدایت ربانی کے تابع تھے۔ اس میں ان کی مرضی یا ارادہ شامل نہیں تھا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: ''وہ اپنی خواہش نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہی کہتا ہے جو خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔'' (النجم)

ہر قوم کو خبردار کرنے کے لیے پیغمبر آئے تاکہ اس قوم کو ہدایات دی جا سکیں۔ راہِ راست پر رکھا جا سکے۔ رسول اسی لیے بھیجے گئے تاکہ اطاعت خداوندی ہو۔ خدا کی مرضی کے مطابق اس کے احکامات پر عمل کیا جائے۔ اس کے احکامات میں بہت زیادہ حکمت ودانائی پنہاں ہوتی ہے لیکن لوگوں کو ان کی مصلحت یا حکمت سمجھ آئے یا نہ آئے، ان کی تعمیل کرنا لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے کہ اذنِ خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔'' (النساء)

اسلامی تعلیمات کا اہم اصول جس پر باقی تمام تصورات کی بنیاد قائم ہے، وہ نظریہ رسالت ہے۔ اس طرح رسول کی اطاعت کرنا در اصل اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ رسول پاکؐ نے دین وشریعت کے دائرے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ یوں رسول پاکؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''جس نے رسول کی اطاعت کی، اُس نے خدا کی اطاعت کی۔''

رسول کا منصب ہی یہ ہے کہ نیکی کی ہدایت کی جائے اور برائی سے منع کیا جائے۔ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ رسول پاک کو اپنے ہی

لوگوں میں مبعوث کیا گیا۔ یہ اللہ کا لوگوں پر بڑا احسان ہے۔ لوگ اپنے جیسے بشر کی بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام یعنی وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں اور حکمت کی تعلیم رسول ہی دیتا ہے۔ رسول پاک حضرت محمد ﷺ کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا کیونکہ انسان اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے مطابق عقل و خرد کی روشنی میں حضورؐ کی دی ہوئی تعلیم کی خود تفہیم و تعبیر کر سکیں۔

حضرت محمد ﷺ کو خدا نے پوری انسانیت کے لیے رسول بنا کر بھیجا۔ قرآن مجید میں تمام زمانوں کے تقاضوں کی تکمیل پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی اور اسوۂ حسنہ سے ان تعلیمات کے عملی پہلو کو روشن کر دیا۔ اس طرح پوری انسانیت کی بھلائی کی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ترجمہ: "کہہ دو! اے لوگو! میں تم ساری دنیائے انسانیت کے لیے اللہ کا رسول ہوں۔" (الاعراف)

حضور پاکؐ نے اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست اور انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کے قوانین احکام الٰہی کی روشنی میں مرتب کیے۔ کوئی شخص بھی مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک توحید اور رسالت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ ایسا کرنے سے انسان کا طریقِ زندگی یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ عقیدوں کی پختگی کی بنا پر احساسِ ذمہ داری سے اللہ اور اللہ کے رسول کا تابع فرمان ہو جاتا ہے۔

رسول پیشوا، نمونہ تقلید، معلم و مربی، شارع، قانون ساز اور قاضی جیسی بے شمار حیثیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ جب لوگوں کو رشد و ہدایت دیتا ہے تو وہ اس پر دلجمعی سے عمل کرتے ہیں۔

معاشرتی انصاف (Social Justice)

معاشرتی انصاف سے مراد یہ ہے کہ معاشرے میں ہر پہلو سے میانہ روی اختیار کی جائے اور کسی کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہ ہو۔ لوگوں کے حقوق پورے ہوں اور وہ اپنی محنت کا پھل اور صلاحیتوں کے مطابق صلہ پائیں۔ معاشرتی انصاف ہی وہ طریقہ کار ہے جس سے معاشرے میں توازن قائم کیا جا سکتا ہے۔

معاشرتی انصاف اسلامی تعلیمات کے اہم اصولوں میں سے ایک ہے۔ کہ پورے معاشرے میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ دھوکا نہ کریں۔ انسان خود بھی اپنی صلاحیتیں استعمال کرے۔ ناانصافی سے بے راہ روی پھیلتی ہے۔ اس طرح عقیدہ میں بھی ناپختگی آتی ہے۔

توحید اور نظریہ رسالت پر ایمان لانے والے معاشرے انصاف کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں میانہ روی اختیار کی جائے کیونکہ میانہ روی ہی عدل ہے۔ نہ تفریط کا شکار ہوا جائے اور نہ ہی افراط کا کیونکہ ایسا کرنے سے انصاف نہیں ہو سکتا۔ عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص جتنا حق رکھتا ہو، اسے اتنا ہی ملے۔ نہ اس سے زیادہ اور نہ کم۔ ہر شخص کو اس کی حیثیت کے اور ضرورت کے تحت قانون کے مطابق حصہ ملے۔

اسلام میں ایسے معاشرے کے قیام کی تلقین کی جاتی ہے جس میں رنگ و نسل کے اختلافات اور تعصبات سے پاک ماحول ہو۔ عدل و انصاف اور عالمگیر برادری کی خوشبو آئے۔ ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں افراد ہمدردی، بھائی چارے اور انسانیت کے رشتے سے منسلک ہوں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: "وہ لوگ جو مومن ہیں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" (الحجرات)

ترجمہ: ''بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور ظلم اور گناہ کی باتوں میں ہرگز باہمی امداد و تعاون نہ کرو۔'' (المائدہ)

معاشرتی انصاف (Social Justice) کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کی جائے۔ مخالفت اور جھگڑے میں نہ پڑا جائے۔ بھائی چارے اور انسانیت کے رشتوں کا ہر پہلو سے لحاظ رکھا جائے۔

خاندان سب سے پہلا اور چھوٹا معاشرہ ہے۔ اپنے گھر میں بھی انصاف کرنا چاہیے۔ ہر کردار کو اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ کسی ایک پر ذمہ داری ڈال کر خود ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا ناانصافی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرنا بھی انصاف ہے اور یہی انداز اور طریق کار پورے معاشرے میں اپنایا جائے تاکہ لوگ عدل و انصاف کے ماحول میں بہتر طور پر اور مثالی زندگی گزار سکیں۔ معاشرے میں عمومی فضا حقیقی طور پر خیر خواہی کی فضا ہو۔ تعاون، امداد، اشتراکِ عمل، ایثار اور بھائی چارے کا انداز اپنایا جائے۔ مثلاً مکہ مکرمہ سے جب حضور پاک ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو ان کا دل کی گہرائیوں سے استقبال کیا گیا۔ مہاجرین کے لیے اپنے گھر اور مال وقف کر دیا۔ مدینہ والوں نے جس محبت اور خلوص سے ان کے معاشرتی اور معاشی مسائل کو حل کیا، ایسے ہی معاشرتی انصاف کی ہدایت کی گئی ہے۔

انسان کو ہمت و کوشش سے زندگی کے مسائل سے نپٹنا چاہیے۔ کوشش کرنا ہی اہم شرط ہے۔ اس سے پورے معاشرے میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ ہر کسی کو ذمہ داری سے زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

ترجمہ: ''انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔'' (النجم)

اسلامی معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے مطابق جذبہ عمل کو بیدار کر کے اعمالِ صالح کرنے کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ معاشرتی انصاف سے بھوک، افلاس، بیماری، وبا اور دیگر برائیوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ فرائض سے پہلے لوگوں کے حقوق پورے کیے جائیں تاکہ وہ اپنی حیثیت اور عمل کے مطابق حق حاصل کر کے بہتر طور پر فرائض کی ادائیگی کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''ہم نے اپنا رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔'' (الحدید)

انسانی معاشرے میں عدل و توازن الہامی ہدایت کے مطابق بہتر طور پر قائم ہوسکتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں توازن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں اعتدال اور توازن پیدا کرنا ہی معاشرتی انصاف ہے۔

رواداری (Tolerance)

انسان کی سب سے بڑی قوت برداشت اور رواداری ہے۔ یہ انسان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو قوی تر بناتی ہے۔ اسلامی تعلیمات اپنی جبلتوں کو کنٹرول کرنے کا درس دیتی ہیں۔ دوسرے کی بات سننے اور تحمل و بردباری سے مسائل و مشکلات میں سے گزرنے کا فن صرف قوت برداشت سے ممکن ہے۔ اس کو ضبطِ نفس بھی کہا جاسکتا ہے۔ ضبطِ نفس کا مطلب انسان کی خودسر جبلتوں کو کنٹرول کرنا ہے۔ قرآن مجید میں نفس انسان کی تین قوتوں کا ذکر آیا ہے۔ قوتِ غضبیہ، قوتِ شہویہ اور قوتِ ناطقہ۔ ان تینوں قوتوں کو اعتدال میں رکھنا اہم کام ہے۔

ہم پانچ ارکانِ اسلام توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی پابندی کر کے قوتِ برداشت کی تربیت کر سکتے ہیں۔

اسلام میں مسلمان کو عفو و درگزر کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ عفو سے مراد ہے کہ دوسرے کی خطا اور قصور معاف کر دیا جائے۔ انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے بھی بخش دیا جائے۔ لیکن اس سے مراد کمزوری نہیں بلکہ اپنی غلطیوں پر نادم ہونے والے کو معاف کر دینا بڑائی ہے۔ کیونکہ انتقام کی آگ بجھانے کے لیے مخالف کو ختم کرنا یا پچھاڑنا بڑائی نہیں ہے، بڑائی اس میں ہے کہ عفو و درگزر سے کام لے کر قوت برداشت اجاگر کی جائے۔ اس سے انسان کے نفس کی تربیت ہوتی ہے اور وہ پہلے سے بہتر شخصیت کا مالک بن جاتا ہے۔

رواداری ایک ایسی صلاحیت ہے جس کی بنا پر انسان مشکل سے مشکل مرحلے کو سر کر سکتا ہے۔ تحمل و بردباری سے ذہنی سکون اور اطمینانِ قلب میسر آتا ہے۔ رواداری (Tolerance) سے انسان نفسیاتی طور پر پختہ اور مضبوط قوتِ ارادی کا مالک بن جاتا ہے۔ اس طرح فشارِ خون اور دیگر مسائل اور رذائل سے بچا جا سکتا ہے۔

غصہ کئی مسائل کی بنیاد ہے۔ فضائل کی نفی ہوتی ہے اور رذائل میں اضافہ لیکن قوتِ برداشت سے غصہ کی حالت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ کوئی انسانی قوت اگر آپے سے باہر ہو جائے تو جذبہ رواداری کی مدد سے اس کو قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ عمر، وقت اور تجربے سے ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔

احساس کی شدید ترین کیفیت، ہیجانی حالت ہوتی ہے۔ ہیجانی حالت خواہ خوشگوار احساس کی بنا پر ہو یا ناخوشگوار حالت کا نتیجہ دونوں صورتوں میں انسان کی ذہنی صحت کے لیے تکلیف دہ ہے۔ ہیجانی حالت پر قابو پانے کے لیے قوت برداشت سے مدد لینی چاہیے جو مشق اور خصوصی ذہنی عمل سے توجہ دینے کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایسا بار بار کیا جائے تو ایک وقت آتا ہے کہ قوت برداشت انسانی کردار کا حصہ بن جاتی ہے انسان دوسروں سے بہتر محسوس کرتا ہے اور دوسروں کے جملہ معاملات میں مدد بھی دیتا ہے۔ اسی لیے اسلامی تعلیمات میں رواداری سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی کریں تو کئی ایک ایسے مقامات کا پتہ چلتا ہے جن میں متعلقہ شخصیات نے خدا اور رسول اکرمؐ کی تعلیمات کی روشنی میں قوتِ برداشت سے جنگ و جدل کو صلح و صفائی میں تبدیل کر دیا۔ صلح حدیبیہ اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔

عالمگیر اخوت (Universal Brotherhood)

عالمگیر اخوت کا مفہوم یہ ہے کہ پوری دنیا میں مسلمان ایک دوسرے کی پاسداری کریں اور ملت اسلامیہ کے تصور کو عملی شکل دیں۔ مسلمان دنیا میں کہیں بھی موجود ہوں، وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ بھائیوں کی طرح اجتماعی طور پر عالمی سطح پر ایک دوسرے کے کام آنا عالمگیر اخوت ہے۔

اسلام اس نظریے کی تعلیم دیتا ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس لیے آپس کے تعلقات میں شفقت اور بھائی چارے کا عنصر غالب ہونا چاہیے۔ آپس کے معاملات میں نرمی اختیار کی جائے۔ ایک دوسرے کا خیر خواہ، خدمت گزار ہوں۔ دلوں میں کدورتیں اور نفرتیں پیدا کرنے والی منفی قوت کو ختم کر دیا جائے۔ اخوت کے یہ تعلقات ملت اسلامیہ کو اجتماعی طور پر مستحکم کرتے ہیں اور پُرامن اور صالح معاشرہ قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ عالمگیر اخوت پوری دنیا کی خیر خواہی سے پروان چڑھتی ہے۔ اسلام دوسرے ادیان کے لوگوں کے ساتھ بھی اچھے سلوک اور

اخوت کی تلقین کرتا ہے۔اسی لیے اسلامی معاشرے میں خصوصی طور پر اقلیتوں کے حقوق کی بات کی گئی ہے۔یہ اندازِ فکر و عمل عالمگیر بھائی چارے کی بنیاد ہے۔

خدا اور رسول پر ایمان لانے کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ انسانوں میں باہمی محبت اور اخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔جب ہمارا ایمان یہ ہو کہ تمام انسان اللہ کی مخلوق ہیں، سب کا مقصد حیات ایک ہے، سب کی اصل ایک ہے، ایک ہی ضابطۂ حیات ہم پر لازم ہے تو انسان دوستی کی تحریک کو پروان چڑھانے کی شروعات ہوتی ہیں۔

دنیا میں لوگوں کے حالات ایک جیسے نہیں رہتے۔دکھ سکھ انسان کے ساتھی ہیں۔انسان کو چاہیے کہ وہ اچھے دنوں میں دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے تاکہ برے وقت میں لوگ اس کا ساتھ دیں۔حسن سلوک سے اخوت اور بھائی چارہ کے جذبات اجاگر ہوتے ہیں۔انفرادی اور چھوٹے معاشرے سے ہوتے ہوئے پوری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔عالمگیر اخوت پروان چڑھتی ہے۔ہمدردی، حسن سلوک، رواداری، احترام اور محبت وخلوص کا درس اسلامی فکر سے ملتا ہے۔اسلام نے عالمگیر اخوت کو عملی صورت پہنائی ہے۔نسلی امتیازات اور طبقاتی اختلافات کی نفی کی ہے۔عالمی انسانی برادری کا تصور پیش کر کے اسلام نے پوری دنیا کو قریب تر کر دیا ہے۔یہی کسی دین کا اصل پیغام ہوتا ہے۔

علماء، مشائخ اور صوفیاء کرام کے کردار نے بھی عالمگیر اخوت کی ترویج و ترقی میں زبردست کردار ادا کیا ہے۔ان کے رویے، اخلاق، طرزِ زندگی کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر تھی اس لیے عالمگیر اخوت کے رشتے میں پوری دنیا کے مسلمان منسلک ہو گئے۔جس طرح افراد اپنے خاندانوں سے، خاندان دوسرے خاندانوں اور قبیلوں سے اور قبیلے اقوام سے منسلک ہوتے ہیں، جس سے آفاقی وحدت میں ضم ہوا جاتا ہے۔جس طرح ملکی اور جغرافیائی سرحدوں کی بنا پر علاقائی قومیں اور وطن ہوتے ہیں۔اسی طرح مذہب کو بنیاد بنا کر قومیں بنتی ہیں۔جیسے مسلمان قوم، عیسائی، یہودی اور دیگر اقوامِ عالم۔اسلامی تعلیمات میں عالمگیر اخوت کے تصور میں مسلم قوم اور پھر مسلم قوم کا دیگر تمام اقوام کے ساتھ بھائی چارے اور اخوت کا عملی جذبہ پایا جاتا ہے۔اس طرح مسلم قوم میں اتحاد، یکجہتی، یگانگت اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہوتی ہے۔اندرونی اور اقوام کے باہمی تنازعات کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: ”لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے اور زمین میں طالبِ فساد نہ ہو۔“ (القصص)

ایک عقیدے اور اخلاق کو ماننے والے اسلامی معاشرہ تعمیر کرتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے انسان سے عقیدہ کی بنا پر تعلقات قائم کرتا ہے۔ارشادِ خداوندی ہے:

ترجمہ: ”سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔“ (آل عمران)

اس طرح ایک مسلم عالمگیر انسانی برادری کا تصور ابھرتا ہے جس میں نیکیوں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے بلکہ سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ برائیوں کو ختم کیا جا سکے۔عالمگیر اخوت ہی وہ طاقت ہے جس کی بنا پر مسلمان اجتماعی اور قومی مسائل کا حل نکال سکتے ہیں۔مسلمانوں میں اگر اس جذبہ میں ترقی و تیزی آجائے تو مخالف قوتوں سے نپٹا جا سکتا ہے۔عالمگیر اخوت کا درس اسلامی تعلیمات میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ابتدا ہی سے بچے کی نشوونما اس نہج پر کی جائے کہ بچے محبت، ایثار اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سبق سیکھیں تاکہ اخوت و بھائی چارہ اس کی خصلت میں رچ بس جائے۔

مشقی سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1- حکمت کا قرآن مجید کی روشنی میں مفہوم واضح کریں۔

2- اسلام کی فکری اساس بیان کریں۔

3- اسلام میں نظریہ توحید کی قرآن مجید کے حوالے سے وضاحت کریں۔

4- نظریہ رسالت اسلامی تعلیمات کے حوالے سے بیان کریں۔

5- استحکام آدمیت پر نوٹ لکھیں۔

6- معاشرتی انصاف اور رواداری کو اسلامی تعلیمات کی مدد سے لکھیں۔

7- اسلامی تعلیمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیجئے کہ کیا عالمگیر اخوت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تبدیلی پیدا کرتا ہے؟

معروضی طرز (Objective Type)

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پُر کیجئے۔

1- حکمت سے مراد علم و فکر سے پیدا ہونے والی.............. ہے۔

2- قرآن مجید پڑھ کر سنانے کے علاوہ رسول پاکؐ کے فرائض میں کتاب و.............. کی تعلیم دینا بھی شامل ہے۔

3- بے شک خدا کے نزدیک تو اصل دین.............. ہے۔ (آل عمران)

4- اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا.............. مقرر کیا ہے۔

5- جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے.............. کی اطاعت کی۔

6- انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ یہ آیت سورۃ.............. کا حصہ ہے۔

7- سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ یہ آیت سورۃ.............. کا حصہ ہے۔

سوال 2: ذیل میں دیئے گئے ممکنہ جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

1- اسلامی تعلیمات کا سب سے اولین اصول ہے۔

i- عقیدہ توحید ii- عقیدہ رسالت iii- حقوق العباد iv- نماز

2- نظریہ رسالت کے مطابق ایمان لایا جاتا ہے۔

i- خدا پر ii- رسول پر iii- ملائکہ پر iv- عقائد پر

3- استحکام آدمیت میں ہوتی ہے۔

i- تکمیل خودی ii- نفی خودی iii- تربیت خودی iv- آزادی

4- ''اے پیغمبر کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا ا رمرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔ یہ کس سورۃ کی آیت ہے۔

i- سورۃ البقرۃ ii- سورۃ الا...... iii- سورۃ والعصر iv- سورۃ النساء

5- ''اللہ زیادہ جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغمبری کس کے سپرد کرنی ہے۔''

i- سورۃ...... ii- سورۃ البقرۃ iii- سورۃ الناس iv- سورۃ............

سوال3: کالم ''الف'' اور کالم ''ب'' میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم ''ج'' میں درج کریں۔

کالم ''الف''	کالم ''ب''	کالم ''ج''
☆ اللہ	ایک اللہ کا تصور پایا جاتا ہے۔	
☆ حضرت محمد ﷺ	خالق ہے۔	
☆ تمام اعمال کا دارومدار	کی تلقین ملتی ہے۔	
☆ توحید میں	آخری نبی ہیں۔	
☆ اللہ ہر شے کا	حکمت والا ہے۔	
☆ اسلام میں اتحاد یکجہتی	نیتوں پر ہے۔	
☆ اسلام	رسول بھیجے گئے۔	
☆ اسلام میں معاشرتی انصاف	آپس میں بھائی بھائی ہیں۔	
☆ وہ لوگ جو مومن ہیں	تعلیم دی گئی ہے۔	
☆ راہنمائی اور ہدایت کے لئے	استحکام آدمیت کا درس دیتا ہے۔	

حل مشقی سوالات

سبق نمبر1: فلسفہ کی تعریف

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

(1) ڈیکارٹ (2) مطالعہ (3) غیر حتمی (4) فیثا غورث (5) سائنسدان (6) قدریات

(7) ایک (8) ایمپیڈوکلیز (9) اکتسابی (10) فکر

سوال 4: ذیل میں دیے ہوئے سوالات کے ممکنہ جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

(1) حب دانش (2) افلاطون (3) الکندی (4) ڈیکارٹ (5) افلاطون (6) ڈیکارٹ

(7) استدلال (8) انسانی کردار (9) منطق (10) استقرائیہ

سبق نمبر2: فلسفہ اور مذہب

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

(1) تفکر (2) معرفت (3) اعتقاد (4) کانٹ (5) ہافڈنگ (6) موت

(7) ایچ۔ایچ۔ٹائنس (8) وحی (9) پروفیسر وائیٹ ہیڈ (10) پروفیسر وائیٹ ہیڈ

سوال 2: ذیل میں دیے ہوئے سوالات کے ممکنہ جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

(1) مذہب (2) کانٹ (3) فریڈرک شیلر (4) ہافڈنگ (5) وائٹ ہیڈ (6) عقلیت

(7) ایمان (8) فرق (9) مشترک (10) تین

سبق نمبر3: فلسفہ اور سائنس

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

(1) مشاہدہ (2) محلول (3) کل (4) شروع (5) حتمی

سوال 2: ذیل میں دیے ہوئے سوالات کے ممکنہ جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

(1) علم (2) دو (3) ووڈورتھ (4) برگساں (5) ڈیموکرائٹس (6) نیوٹن

(7) ڈبلیو۔ٹی۔ سٹیس (8) سپنسر (9) آئن سٹائین (10) ڈبلیو۔ٹی۔سٹیس

سبق نمبر4: علم

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات یا الفاظ سے خالی جگہ پر کریں۔

(1) حیرانی (2) وحی (3) عقل (4) ڈیکارٹ (5) التباس (6) وہبی

(7) اشیا (8) علم (9) شخصیت (10) استنادیت

سوال 2: ذیل میں دیے ہوئے سوالات کے ممکنہ چار جواب میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

(1) علمیات (2) جان ہاسپر (3) پیدائشی طور پر (4) تصدیق (5) عقل سے (6) تجربہ سے (7) ڈیکارٹ

سبق نمبر 5: مابعدالطبیعیات

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پر کریں۔

(1) عنصر (2) زوال (3) پانی (4) غیر جانبدار (5) دو (6) معروضی

(7) موضوعی (8) معروضی (9) ہیگل (10) وہم

سوال 2: ذیل میں دیے ہوئے سوالات کے ممکنہ جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

(1) ماورا (2) مادی (3) ایک جوہر سے (4) دو جواہر سے (5) لاتعداد جواہر سے (6) تصورات

(7) مادہ (8) افلاطون (9) ہیگل (10) ڈیموقریطس

سبق نمبر 6: اخلاقیات

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پر کریں۔

(1) اخلاقیات (2) مثالی (3) یونانی (4) اخلاقیات (5) نیت (6) سنہری

(7) دو (8) تہذیب الاخلاق (9) ارادہ طیبہ (10) افادیت

سبق نمبر 7: اسلامی اقدار

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پر کریں۔

(1) شر (2) شرک (3) معتزلہ (4) ابو الحسن الاشعری (5) توحید

(6) قادر (7) عدل وانصاف (8) اجتماعی (9) فرائض (10) دین

سوال 2: ذیل میں دیے ہوئے سوالات کے ممکنہ جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

(1) سورۃ التین (2) انسانیات (3) قرآن مجید (4) خدا (5) واصل بن عطا (6) اخلاص

(7) شرک (8) توحید (9) نور (10) والدین کے

سبق نمبر 8: حکمت: مفہوم اور دائرہ کار

سوال 1: درج ذیل فقرات میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور الفاظ سے خالی جگہ پر کریں۔

(1) بصیرت (2) حکمت (3) اسلام (4) نائب/خلیفہ (5) خدا (6) النجم (7) آل عمران

سوال 2: ذیل میں دیے ہوئے سوالات کے ممکنہ جوابات میں سے صحیح کی نشاندہی کریں۔

(1) عقیدہ توحید (2) رسول پر (3) تکمیلِ خودی (4) سورۃ الانعام

فرہنگ (Glossary)

اجتماعی شعور	Collective Consciousness
احترامِ خودی	Self Respect
احتمال	Probable
احدیت	Monism
اخلاقی نظریات	Ethical Theories
اخلاقیات	Ethics
ادراک	Perception
ادراک	Perception
ارادہ طیبہ	Good Will
استحکامِ آدمیت	Solidarity of Mankind
استدلال	Reason
استنادیت	Authoritarianism
اسلامی اقدار	Islamic Values
اسلامی نظریہ اخلاق	Islamic Theory of Ethics
اسلامی نظریہ	Islamic Theory
خیرِ اعلیٰ	Highest Good
افادیت	Utilitarianism
التباس	Illusion
بعد	Meta
تصدیق	Verification
تصوریت/مثالیت	Idealism
تعبیر	Interpretition
تنقید	Criticism
ثقافت	Culture
ثنویت	Dualism
قدر پیمائی/جائزہ	Evaluation
جمادات	Geology
جمالیات	Aesthetics
جواز	Justification
ایٹم۔جوہر	Atom
عنصر	Element
جوہر	Substance
حقوق العباد	Human Rights
حکمت	Wisdom
حواسِ خمسہ	Five Senses
حیوانیات	Zoology
حُسن	Beauty
خیر	Good, Goodness

بیانیہ	Descriptive
پس جدیدیت	Post Modernism
پیمائش	Measurememt
تجربہ گاہ	Laboratory
تجربیت پسند	Empirisist
تحلیلی	Analytic
تخمین	Assessment
تخیل	Imagination
ترکیب	Synthesis
تشریحی	Explanatory
صحت	Validity
صداقت	Truth
صوری صحت	Formal Validity
طبعی علم	Natural Science
طبیعات	Physics
عالمگیر اخوت	Universal Unity
عقلیت پسند	Rationalist
علتی رشتے	Casual Relations
طبی	Medical

دانش	Wisdom
دائرہ کار	Scope
دعویٰ	Thesis
ذرات	Monads
ذمہ داریاں	Responsibilities
رد دعویٰ	Anti-thesis
روحانیت	Spiritualism
زریں وسط/سنہری وسط	Golden Mean
سوچ بچار	Speculation
مادیت	Materialism
ماخذِ علم	Sources of Knowledge
مجرد	Abstract
حد	Term
مذہب	Religion
مشاہدہ	Observation
معاشرتی انصاف	Social Justice
معروضی تصوریت/مثالیت	Objective Idealism
معروضی سوالات	Objective Questions

علمیات	Epistimology
عوامل	Factors
سری طاقت	Occult Force
فرائض	Duties
فطرتیت	Naturalism
فکر	Thought
فلسفہ قرونِ وسطیٰ	Mediveal Philosophy
فلسفہ جدید	Modern Philosophy
فلسفہ قدیم	Ancient Philosophy
فلسفہ	Philosophy
فلسفیانہ نہج	Philosophical Approach
فطری/قدرتی قوانین	Natural Laws
قدریات	Axiology
قدر	Value
قوتِ برداشت	Tolerance
کائنات	Universe
کثرتیت	Pluarlism
کیمیا	Chemistry
مابعد الطبیعات	Metaphysics
مادی انقلاب	Material Revolution
مادی صحت	Material Validity
معیاری علم	Normative Science
ممکنات	Possibilities
مناقشات	Conflicts
منطق استخراجیہ	Deductive Logic
منطق استقرائیہ	Inductive Logic
منطق	Logic
موضوعی تصوریت	Subjective Idealism
موضوعی سوالات	Subjectibve Questions
نباتات	Botany
نظامِ عصبی	Nervous System
ایٹمی نظریہ/جوہری نظریہ	Atomic Theory
نظریہ تشخص	Identity Theory
نظریہ لذتیت	Hedonism
نفسیات	Psychology
وجدان	Intuitions
وجودیات	Ontology
وقوفی عمل	Cognitive Process
وہبی خیالات	Innate Ideas
وہم	Hallucination
ہستی	Being

کتابیات

-1	علامہ محمد اقبالؒ: ترجمہ: نذیر نیازی	تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ	بزم اقبال، لاہور
-2	کرامت حسین جعفری	منطق استخراجیہ ایم آر برادرز	اردو بازار، لاہور
-3	کرامت حسین جعفری	منطق استخراجیہ ایم آر برادرز	اردو بازار، لاہور
-4	جاوید اقبال ندیم	وجودیت	وکٹری بک بنک، لاہور
-5	امام الغزالیؒ	احیائے علوم الدین (جلد اول)	
-6	امام الغزالیؒ	افکار غزالی	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور
-7	جاوید اقبال ندیم	شذرات فلسفہ	وکٹری بک بنک، لاہور
-8	جاوید اقبال ندیم	تناظرات تعلیم	وکٹری بک بنک، لاہور
-9	خورشید احمد	اسلامی نظریہ حیات	کراچی یونیورسٹی، کراچی
-10	سی۔اے قادر	اخلاقیات	مرکزی اردو بازار بورڈ، لاہور
-11	علی عباس جلال پوری	روایات فلسفہ	خرد افروز، جہلم
-12	نعیم احمد	تاریخ فلسفہ یونان	علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور
-13	جاوید اقبال	ابن مسکویہ کا فلسفہ اخلاق	وکٹری بک بنک، لاہور
-14	عاصم صحرائی	بنیادی نفسیات	اے ون پبلشرز، اردو بازار، لاہور
-15	سیرت النبیؐ	شبلی نعمانی	اعظم گڑھ
-16	ڈاکٹر ابوسعید نورالدین	اسلامی تصوف اور اقبال	اقبال اکادمی، کراچی
-17	سکف اور سکف ترجمہ ڈاکٹر انیس الدین ملک	سائنس دانوں کے عظیم کارنامے	دارالشعور، اردو بازار، لاہور
-18	ایڈون۔اے برٹ ترجمہ: بشیر احمد ڈار	فلسفہ مذہب	مجلس ترقی ادب، لاہور
-19	غلام احمد حریری	اساس اسلام	پولیمر پبلیکیشنز، اردو بازار، لاہور
-20	ڈاکٹر عبدالخالق، یوسف شیدائی	مسلم فلسفہ	عزیز پبلشرز، اردو بازار، لاہور
-21	محمد رفیق چوہان	تاریخ فکر یونان	علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور
-22	جاوید اقبال ندیم	ذوق سلیم	وکٹری بک بنک، لاہور
-23	جاوید اقبال ندیم	تحقیقی مضمون، اعلیٰ تعلیم میں فلسفہ کا کردار	مجلہ راوی، گورنمنٹ کالج، لاہور
-24	قاضی قیصر الاسلام	فلسفے کے بنیادی مسائل	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
-25	عطا الرحیم	تعارف نفسیات	کفایت اکیڈمی، کراچی
-26	خان محمد چاولہ	اسلام کا فلسفہ	علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور

Bibliography

S.No.	Name of the Author	Name of the Book
1	A. E. Taylor	Elements of Metaphysics University Paperbacks.
2	Samnel E. Stumpf	Elements of Philosophy: Mc. Graw-Hill Book Company.
3	E. D. Klemke	Philosophy the Basic Issues: St. Martin's Press New Yark.
4	Droon K. Ghosh	Science, Society & Philosophy: Ajanta Publication Delhi.
5	John Hospers	An Introduction to Philosophical Analysis. Routledge and Kegan Paul Ltd.
6	Albert Schwegler	History of Philosophy: Akashdeep Publishing House Delhi.
7	Irving M.Copi &Carl Cohen	Introduction to Logic: Prentice-Hall International USA.
8	H. H. Titus	Elements of Philosophy.
9	Bertrand Russell	History of Western Philosophy: Routledge London.
10	H. Hocking	Types of Philosophy.
11	H. H. Titus	The Range of Philosophy.
12	N. Warburton	The Classics of Philosophy.
13	N. Warburton	The Classics of Philosophy.
14	M. Iqbal	Reconstruction of Religious thought in Islam.
15	Enwar Eshrat	Metaphysics of Iqbal
16	A. R. Laicy	Dictionary of Philosophy.